صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

رسولِ کریم

مغرب کے شہرۂ آفاق مفکر "کارلائل" کا
حضورِ اقدس کو خراجِ تحسین!

◎

اسلام پر کارلائل کے اعتراضات کے مُسکت جواب!

◎

مؤلفہ : پیام شاہجہانپوری

شائع کردہ
ادارۂ تاریخ و تحقیق
این/۲۳، عوامی فلیٹس، ریواز گارڈن لاہور (۵۴۰۰۰)

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں)

نام کتاب : "رسول کریمؐ"
مولف : پیام شاہجہانپوری
ناشر : رضی الدین خاں
طابع : مولوی شوکت پریس
پرانا نائلہ سینما موہنی روڈ لاہور
مقام اشاعت : 23/این عوامی فلیٹس ریواز گارڈن لاہور
بار اول : اکتوبر 1999ء
ٹیلی فون : 7322313

ہدیہ: 100 روپے

شکریہ

ڈسٹ کور پر کتاب کا نام لکھنے کی سعادت لاہور کے نامور خطاط جناب منظور انور کے حصے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے آمین۔

حرفِ مدّعا

یورپ کے ممتاز مسیحی دانشور تھامس کارلائل نے قریباً" ڈیڑھ صدی قبل ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی شخصیت اور سوانح کے بارے میں ۸ مئی ۱۸۴۰ء کو جمعہ کے دن لندن کے ایک ہال میں بڑا بھرپور لیکچر دیا تھا جو ان کی کتاب "HEROES AND HERO WORSHIP" میں دوسرے لیکچر کے طور پر شامل ہے اور اس کا عنوان ہے "THE HERO AS PROPHET" کارلائل کا ہم سب پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ یورپ کے تنگ نظر اور متعصب پادریوں اور ان کے زیر اثر بعض مسیحی مصنفوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے بارے میں جو غلط اور گمراہ کن خیالات اہل یورپ میں پھیلا دیئے تھے، کارلائل نے اپنے اس بصیرت افروز لیکچر میں ان کا قلع قمع کر دیا اور ہمارے رسولِ معظم کی مقدس شخصیت کے جوہر تاباں کو پوری تابانی سے نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

کارلائل کے اس لیکچر کا اردو زبان میں پہلا ترجمہ پروفیسر مہدی حسین ناصری نے کیا اور یہ ترجمہ "سرورِ انبیاء" کے نام سے ۱۹۱۲ء میں معیار پریس رستم نگر لکھنؤ کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۶۴ صفحات ہے اور اس کے ساتھ بعض مفید ضمیمے بھی شامل ہیں۔ مجموعی ضخامت ۹۷ صفحات ہے۔ ناصری صاحب نے کسی قدر اختصار سے کارلائل کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کی اور ان کے ازالے کی کوشش بھی فرمائی۔

اسی ترجمے کا دوسرا ایڈیشن نظرثانی کے بعد ۱۹۱۷ء میں نیشنل پریس الہ آباد سے شائع ہوا اس میں بہت سے مفید اضافے کئے گئے۔ اس دوسرے ایڈیشن کی ضخامت ۱۲۶ صفحات تھی، مگر اب یہ دونوں ایڈیشن ناپید ہیں۔ میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا تھا بلکہ مذکورہ لائبریری کے سربراہ اور اپنے کرم فرما جناب جمیل احمد رضوی کی عنایت سے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی حاصل کرلی تھی۔

کارلائل کے اس لیکچر کا دوسرا ترجمہ پروفیسر اعظم خاں لیکچرار جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے "سیدؐ الانبیاء" کے نام سے کیا۔ اس ترجمے کو ایک بہت بڑا اعزاز یہ حاصل ہے کہ اس کا پیش لفظ قائد اعظم محمد علی جناح نے لکھا تھا۔ جس میں انہوں نے کارلائل کے اس لیکچر کو بہت بڑا اور قابل قدر کارنامہ قرار دیا ہے، اسے "مرد عاقل" کے لقب سے نوازا ہے۔ یہ پیش لفظ قائد اعظم نے ۲۶ اگست ۱۹۴۴ء کو مالا بار ہل بمبئی میں سپرد قلم کیا تھا۔ اس ترجمے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۴ء کے قریب اور قیام پاکستان سے قبل شائع ہوا مگر یہ ایڈیشن ہماری نظر سے نہیں گزر سکا۔ اس ترجمے کا دوسرا ایڈیشن قیام پاکستان کے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء میں "کاروان ادب" کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوا اس کی ضخامت ۹۶ صفحات ہے۔ ایک بھرپور مقدمہ اور کارلائل کے مختصر سوانح بھی شامل اشاعت کئے گئے ہیں۔ (۱)

زیر نظر ترجمہ جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے ان دونوں ترجموں کو

---

(۱) پروفیسر اعظم خاں کے اس ترجمے "سید الانبیاء" کے کچھ اقتباسات لاہور کے ایک مشہور رسالے نے اپنے "رسول نمبر" میں "سید الانبیاء" ہی کے نام سے شائع کئے مگر افسوس کہ مترجم کا نام حذف کر دیا جس نے اس محنت شاقہ اور جگر کاوی سے اس کا ترجمہ کیا تھا، یہ بہت ہی ناپسندیدہ حرکت ہے۔

(پیام)

سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور ترجمہ کرتے وقت کارلائل کی اصل کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کے اس ایڈیشن کو سامنے رکھا گیا ہے جو ۱۹۶۴ء میں DENT.:London کے زیر اہتمام W.HUDSON کے انٹروڈکشن کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ کارلائل کی کتاب کا یہ انگریزی ایڈیشن میرے عزیز دوست اور گورنمنٹ کالج لاہور کے استاد پروفیسر شیر محمد گریوال صاحب نے میرے لئے مہیا کیا میں ان کا ممنون ہوں۔

کارلائل کے انگریزی لیکچر اور اس کے دونوں فاضلانہ ترجموں میں ابواب قائم کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ یہ اہتمام میں نے کیا ہے اور ذیلی عنوانات بھی قائم کردیئے ہیں تاکہ کتاب میں تنوع پیدا ہو جائے اور اسے زیادہ قابل فہم بنایا جا سکے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ حضورؐ اقدس کی سیرت و سوانح اور شخصیت سے متعلق ہے جو کارلائل کے خیالات و افکار کا ترجمہ ہے۔ دوسرا حصہ قرآن شریف اور اسلام کے بارے میں کارلائل کے ان غلط خیالات کی تردید کے لئے وقف ہے جو انہوں نے اپنے اس لیکچر میں ظاہر کئے ہیں۔ اگر میں ان غلط خیالات کی تردید نہ کرتا تو کتاب کے قارئین بجا طور پر یہ تاثر لیتے کہ بطور مترجم شاید مجھے بھی کارلائل کے ان غلط خیالات سے اتفاق ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت کردوں کہ کتاب کے دوسرے حصے میں کارلائل کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے "اسلام اور مسیحیت" کے زیر عنوان قرآن اور بائیبل کا جو تقابلی موازنہ میں نے پیش کیا ہے اس میں مجھے بائیبل کی بعض عبارتوں کو زیر بحث لانا پڑا۔ یہ ناخوشگوار فرض میں نے مجبوراً ادا کیا مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں بائیبل کو ناقابل اعتنا سمجھتا ہوں۔ ہرگز ایسا نہیں بائیبل میں شامل کتابیں جو اللہ کے مقدس انبیاء سے منسوب ہیں وہ بلاشبہ آسمانی صحائف

ہیں جن پر ایمان لانا ہم پر فرض کیا گیا ہے مگر افسوس کہ بعد کے لوگوں نے ان میں تغیر و تبدل کر دیا۔ ہمارے پیش نظر بائیبل کے یہی موجودہ تحریف شدہ صحائف ہیں نہ کہ وہ اصل صحائف جو حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت مسیحؑ ابن مریمؑ پر نازل ہوئے تھے۔ ان کا تو ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی تھا۔ ان کے جو حصے تحریف سے محفوظ رہے ان میں یہ سچائی آج بھی جھلک رہی ہے جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کا "خطبہ کوہ" جو "پہاڑی وعظ" کے نام سے مشہور ہے۔

آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اپنے فاضل دوست جناب سید جمیل احمد رضوی (چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لاہور) کا جنہوں نے اس کتاب کے سلسلے میں مجھ سے نہایت مخلصانہ تعاون فرمایا۔ میرے لئے کیٹلاگ کے پاس کھڑے ہو کر کتابوں کے نمبر تلاش کرنا تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے اگرچہ اس مرحلے سے بارہا گزرنا پڑا مگر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی حد تک سید جمیل احمد رضوی صاحب نے مجھے اس زحمت سے بچالیا اور میری حسب طلب کتابوں کے انبار میرے سامنے لگوا دیئے۔ یہی نہیں، بعض روایتوں کی تلاش میں موصوف نے میرے ساتھ تعاون کیا اور دو تین روایتیں انہی کی توجہ سے مجھے ملیں۔ اسی طرح میرے ایک اور کرم فرما حافظ مختار احمد صاحب گوندل لائبریرین شیخ زید اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب نے بھی تعاون فرمایا اور پوری لائبریری میرے DISPOSAL پر چھوڑ دی میں ان کا بھی ممنون ہوں۔

بات ختم کرتے ہوئے اتنا اور عرض کر دوں کہ کارلائل کے مفہوم کی وضاحت کی غرض سے بعض مقامات پر خطوط وحدانی میں مناسب الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ وضاحتی الفاظ میرے ہیں کارلائل کے نہیں۔

آج 7 جولائی ہے اور یہی میری تاریخ پیدائش بھی ہے، الحمدللہ۔

پیام شاہجہانپوری
N/٢٣ عوامی فلیٹس ریواز گارڈن لاہور
٧ جولائی ١٩٩٩ء فون: ٧٣٢٢٣١٣

فہرست عنوانات

عنوان صفحہ
حرف مدعا 3
تھامس کارلائل 15
تمہید 19
کارلائل کو قائد اعظم کا خراج تحسین 23
میری والدہ کا خواب 24

پیغمبرؐ صادق

حضورؐ اقدس کے بارے میں 27
اہل یورپ کی بہتان طرازیاں
جھوٹا مدعی ء نبوت کامیاب نہیں ہوتا 29
وجود باری کا مظہر 31

پیغمبرؐ صدق

حضورؐ اقدس کا وطن

عربوں کے فطری خواص 35
عربوں کی مذہبیت 36
خانہ ء کعبہ کی عظمت 38
عنوان صفحہ
مکہ اور اس کی اہمیت 39

حضورؐ اقدس کی ولادت

حضورؐ اقدس کے سفر 42
پیغمبرؐ امی 43
حضورؐ اقدس کے اخلاقی کمالات 44
حسن سیرت و صورت کا مرقع 45
حضورؐ اقدس کی شادی "

روح پاک

حیات قدسی کا لطیف پہلو 47
پاک طینت وجود 48
حقیقت کی تلاش 49
دو میں سے ---- ایک راستہ 50
خلاف عقل الزام 51

نزول وحی

غار حرا میں خلوت نشینی 52
اسلام کی روح 54
راضی برضا 55

عنوان صفحہ
پیغمبرؐ ہدایت 56
حضورؐ اقدس کی عظمت کا ایک ایمان افروز واقعہ 57

تبلیغ کا آغاز

پہلی دعوت عام 59
سولہ سالہ علیؓ 60
حضورؐ اقدس کی مخالفت 61
ہجرت حبشہ کا حکم 63
حضورؐ اقدس کو شہید کرنے کا منصوبہ 〃

ہجرت

مدینہ میں پرتپاک استقبال 66
حضورؐ اقدس کی جنگیں دفاعی تھیں 67
مذہب عیسوی کی اشاعت میں بھی تلوار کا دخل تھا 68
حضورؐ اقدس کی کامیابیاں قانون قدرت کے مطابق تھیں 69

عنوان صفحہ
دروغ گوئی کو کبھی پذیرائی نصیب نہیں ہوتی 〃
ہمارے دل حقیقت سے محروم ہو گئے 70

حضورؐ اقدس کا دین

حضورؐ اقدس کا اعلان صداقت 73
ہمارے لئے صرف حضورؐ اقدس کا پیغام ہی قابل قبول ہے 74
عقیدہء تثلیث اور اسلام 〃

قرآن مقدس

قرآن کی اثر آفرینی 77
حضورؐ اقدس کا ماحول جس میں قرآن نازل ہوا 78
قرآن کا خلوص 79
حضورؐ اقدس کا معجزہ 80
قرآن میں انسانی تخلیق کا بیان 82
قرآن کا شعری حسن 83
حضورؐ اقدس پر عظیم انکشاف 84

عنوان صفحہ
اسلام عیش و عشرت کا مذہب نہیں 85

حضورؐ اقدس کی شخصیت

حضورؐ اقدس کا دامن حرص و ہوس سے پاک تھا 88
حضورؐ اقدس کا دل دردمند 90
حضورؐ اقدس کی حقیقت پسندی 92
زندگی کے بارے میں حضورؐ اقدس کا نظریہ 94

عنوان صفحہ

اسلام کا پیغام

اسلام کا تصور جنت 97
گوئٹے کا اسلامی نظریہ 98
حضورؐ اقدس کا نظریہ کہ اعمال کا اثر روح پر پڑتا ہے 100
حضورؐ اقدس کے نزدیک مقصد حیات؟ 101
اسلام کی غیر معمولی ہردلعزیزی 103
حضورؐ اقدس، اسلام اور عرب 105

حصہ دوئم

(کارلائل کے اعتراضات کے جواب)

اسلام اور مسیحیت

فضیلت کا پیمانہ 110
حضرت مسیحؑ کا باپ؟ 114
قرآن میں ولادت مسیحؑ کا بیان 118
ترتیب واقعات 121
بائیبل کا تضاد 126
انبیا کی ہتک 134
حضرت نوح کے ساتھ بائیبل کا سلوک 〃
قرآن کا نوحؑ 135
حضرت لوطؑ سے بائیبل کا سلوک 137

عنوان صفحہ
قرآن کا لوطؑ 138
حضرت موسیٰؑ سے بائیبل کا سلوک 139
قرآن کا موسیٰؑ ″
حضرت یعقوبؑ سے بائیبل کا سلوک 140
قرآن کا یعقوبؑ 145
حضرت سلیمانؑ سے بائیبل کا سلوک 146
قرآن کا سلیمانؑ 149
بائیبل میں خدا تعالیٰ کی ہتک 151
قرآن کا خدا 154
قرآن اور تخلیق کائنات 157
تخلیق کائنات کی مدت؟ 159
زمین کی گردش کا قرآنی نظریہ 162
تخلیق آدم کا بائیبلی نظریہ 163
تخلیق آدم کا قرآنی نظریہ
تخلیق حوا کی بائیبلی داستان 167
تخلیق حوا کا قرآنی نظریہ 168
پسلی سے پیدا ہونے کا مطلب 170
بائیبل کا مقام آدم 172
بائیبل کا عورت پر ظلم 174
عنوان صفحہ

قرآن کی ترتیب

علمائے اہل تشیع کا مذہب 180
حضور اقدسؐ کا طریقہ مبارک 182
جامع قرآن خود حضور اقدسؐ ہیں 184
قرآن کو ایک جلد میں جمع کرنے کی فوری وجہ 187
قرآن کی اشاعت کا آغاز 190
اختلاف قرات 192
حضرت علیؓ کی تائید 194
جمع قرآن میں انتہائی احتیاط 196
حضور اقدسؐ کی ترتیب 198
”۹ھ تک نزول قرآن قریباً“ مکمل ہو چکا تھا 206
قرآن حضورؐ کے عہد میں جمع کیوں نہیں ہوا؟ 208
جمع قرآن الٰہی فعل ہے 209

عنوان صفحہ

قرآن خدا کا کلام ہے

قرآن کا اپنے بارے میں بیان 212
جبریلؑ کا واسطہ 215
قرآن میں امور غیب 219
دو سمندروں کے مل جانے کی خبر ″
مملکت اسرائیل کے قیام کی خبر 220
سفر کی سہولتوں کی خبر 222
بموں اور ایٹمی ہتھیاروں کی خبر 224
کتب و رسائل کی کثرت اشاعت کی خبر 227
فرعون کی جسمانی نجات کی خبر 228
دشمنان رسولؐ کی ذلت کی خبر 232

قرآن اور قریش مکہ

عتبہ بن ربیعہ کا خراج تحسین 237
نضر بن حارث کا خراج تحسین 239
ولید بن مغیرہ کا خراج تحسین 242
خالد بن عقبہ کہتا ہے 244
حکیم ضماد کا اعتراف عجز 245
لبید کی ترک شعر گوئی 247
تکرار کا اعتراض 248
عنوان صفحہ
خدا کی بادشاہی ″
گم شدہ بھیڑیں 254

قرآن کی جنت

روحانیت کی غلط تعریف 255
جنت کے پھل؟
جنت کی شراب؟ 257
جنت کی دوشیزائیں؟ 259
جنت کی نعمتوں کی حقیقت 261
حقیقی جنت؟ 262

رسول کریمؐ کی جنگیں

رسول اقدسؐ کا عفو و درگذر 266
دشمنوں کے لئے دعا 267
حضور اقدسؐ کا جنگ سے انکار 268
قرآن کریم کی شہادت 269
جنگ کا حکم 270
اسلام کا اصول جنگ 272

مقام محمدؐ

انبیائے سابقین مقامی نبی تھے 276

عنوان — صفحہ

آنحضورؐ سارے بنی نوع انسان کے لئے مبعوث ہوئے 277
آنحضورؐ سارے انبیاء کے جامع کمالات تھے 278
آنحضورؐ کے ذریعے نوبہ نو صفات الٰہیہ کا ظہور 279
آنحضورؐ انبیائے سابقین کے مصدق تھے 280
بنی اسرائیل کے لئے موعود رسولؐ 281

عنوان — صفحہ

حضرت موسیٰؑ کی تصدیق 283
حضرت مسیحؑ کی بشارت 285
آنحضورؐ سراج منیر ہیں 289
آنحضورؐ کا وصل الٰہی 291
آنحضورؐ کو مقام محمود پر فائز کیا گیا 292
آنحضورؐ کا خصوصی ادب 293
آنحضورؐ کے وقت عزیز کی قدر کرنے کا حکم 294

Embrace destitution

تعارف

تھامس کارلائل

دنیا کے بہت سے عظیم لوگوں کی طرح تھامس کارلائل نے بھی غربت کی آغوش میں آنکھ کھولی اور تنگدستی کی گود میں پلا۔ وہ ایک غریب سنگ تراش جیمز کارلائل کا بیٹا تھا۔ انگلستان کے شہر "ڈمفریز شائر" (Dumfries-Shire) کے قریب واقع ایک چھوٹی سی بستی "Ecclefechan" (ایکلی فیکن) میں ۴ دسمبر ۱۷۹۵ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی پھر "ANNAN ACADEMY" (انان اکادمی) میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لئے ایڈنبرا چلا گیا اور ایڈنبرا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا مگر تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ آخر اس نے درس و تدریس کے پیشے سے وابستگی اختیار کر لی۔ ۳۱ سال کی عمر تک کارلائل نے تجرد کی زندگی بسر کی اور اپنی توجہ کا مرکز صرف اور صرف حصول علم کو بنائے رکھا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو "جین بیلی ویلش" (Jane Baillie Welsh) نامی خاتون سے اس نے شادی کر لی۔ (۱)

کارلائل نے پیشہ معلمی سے وابستگی کے دوران مطالعہ بھی جاری رکھا حتیٰ کہ

---

(۱) کارلائل کے متعلق یہ معلومات Heroes and Hero-Worship کے اس ایڈیشن سے ماخوذ ہیں جو W.H.Hudson کے انٹروڈکشن کے ساتھ Dent:London کے زیر اہتمام ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ (Page:2)

اس کی نئی نویلی دلہن اور شادی کے بعد کے پرکیف شب و روز بھی اس کے مطالعہ میں حائل نہ ہو سکے۔ ادب، تاریخ، فلسفہ، دینیات اور قانون اس کی دلچسپی کے خاص شعبے تھے۔ جلد ہی اس نے درس و تدریس کو بھی خیرباد کہہ دیا اور تالیف و تصنیف کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ اس غرض کے لئے اس نے لندن اور پیرس کے سفر کئے اور یورپ کے ان دو بڑے شہروں میں مقیم ہو کر اپنے ذوق علم کی آبیاری کرتا اور اپنی تصانیف کے لئے مواد فراہم کرتا رہا۔ اس کی پہلی تصنیف "سارٹر یسارٹس" ہے جس میں اس نے اپنا مخصوص فلسفہء حیات پیش کیا ہے۔ ابتدا میں اس کی یہ کتاب لندن کا کوئی پبلشر شائع کرنے کو تیار نہ تھا مگر ۱۸۸۲ء میں اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ صرف ایک اشاعتی ادارے نے اس کی ستر ہزار جلدیں شائع کیں۔ (۲)

کارلائل کی دوسری اور سب سے مشہور و مقبول کتاب "انقلاب فرانس" ہے۔ اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب شاید ہی لکھی گئی ہو۔ کارلائل کی اور بھی متعدد تصانیف شائع ہوئیں جن میں جرمن ادب کی تاریخ، فرڈرک اعظم کی لائف اور "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" شامل ہیں۔ اس آخری کتاب نے تو اسے زندہ و جاوید کردیا۔

اس کی علمی و ادبی خدمات کی بلاشبہ بہت قدر کی گئی۔ ۱۸۶۵ء میں اسے ایڈنبرا یونیورسٹی کا لارڈ ریکٹر مقرر کردیا گیا۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جہاں سے ڈگری حاصل کرنے میں وہ ناکام رہا تھا۔ یہ خالص علمی اعزاز تھا اس لئے اس نے قبول کرلیا ورنہ وہ جاہ طلبی اور حکمرانوں کی قربت سے کوسوں دور رہتا تھا۔ وہ بہت خوددار، روشن دماغ، نڈر اور بیباک انسان تھا۔ اس میں استغنا کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسے حکومت برطانیہ کی طرف سے لارڈ کا خطاب اور "جی۔ سی۔ بی" کا اعزاز پیش کیا گیا

---

(۲) "سرور انبیا" ص ۱۲۔ از پروفیسر مہدی حسین ناصری مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد۔ (۱۹۱۷ء)

مگر اس نے یہ دونوں حکومتی اعزاز پائے حقارت سے ٹھکرا دیئے اور مال و منال کی ہوس اور سرکاری منصب کے داغ سے اپنا دامن محفوظ رکھا۔

کارلائل نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ انگلستان کے شہر ایڈنبرگ میں گزارا جہاں اس کی مستقل رہائش تھی۔ آخر میں وہ چیلسی (Chelsea) نامی مقام پر منتقل ہو گیا اور ۸۶ سال کی عمر پاکر ۴ فروری ۱۸۸۱ء کو اسی شہر میں اس عظیم ادیب، مفکر اور فلسفی کا انتقال ہو گیا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ ایک مسیحی دانشور خاتون نے اسے اپنی صدی کا پیغمبر قرار دے دیا۔ حالانکہ خود کارلائل نے ایسا مبالغہ آمیز دعویٰ کبھی نہیں کیا اور ایسی لغویات سے خود کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔

کارلائل صرف انگلستان ہی کا نہیں بلکہ دنیا کا بہت بڑا ادیب، انشاپرداز اور مفکر تھا۔ اس کی انگریزی اتنی پرشوکت ہے کہ بعض مقامات پر تو روح وجد کر اٹھتی ہے، اس کا اسلوب نگارش دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی دل و دماغ اور غیر معمولی صلاحیتیں لے کر دنیا میں آیا تھا، اس کی نگاہ اتنی حقیقت بیں تھی کہ گویا حقائق اس کے سامنے خود نقاب الٹ کر آ کھڑے ہوتے تھے۔

کارلائل کی ان خصوصیات و کمالات کا اندازہ اس کی زیر نظر کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کے مطالعے سے ہوتا ہے جس کا دوسرا لیکچر "HERO AS PROPHET" اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اگرچہ کارلائل عربی پر عبور نہیں رکھتا تھا مگر اس کے باوجود جس عربی لفظ پر وہ غور کرتا تھا اس کے معنی کی تہہ تک اسکی باریک بیں نگاہ رسائی حاصل کرلیتی تھی اور اس لفظ کا مکمل پس منظر اس کی نگاہ باطن کے سامنے آجاتا تھا اس کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"آج رات کو قاہرہ کی سڑکوں پر سے جب کوئی راہ گیر گزرے گا تو

آہٹ پاکر (سرکاری) محافظ آواز دے گا کہ کون جا رہا ہے؟ جواب میں راہ گیر اپنا نام اور پتا بتائے گا اور (اپنے مسلمان ہونے کی شناخت کرانے کے لئے) کہے گا کہ:

"THERE IS NO GOD BUT GOD." (PAGE : 310)

آپ کو معلوم ہے کہ کارلائل نے کیا کہہ دیا؟ اس نے "لا الہ الا اللہ" کا ترجمہ کیا ہے، دنیا کی سب سے بڑی حقیقت انگریزی میں بیان کر دی (حالانکہ ابھی کسی مسلمان عالم دین نے قرآن کا انگریزی میں ترجمہ بھی نہیں کیا تھا) اس نے کہا ہے کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں ہے۔ کیا اسلامی کلمے "لا الہ الا اللہ" کا اس سے بہتر انگریزی ترجمہ ممکن ہے؟ ہمارے خیال میں تو آج تک اسلامی کلمے کا اس سے بہتر ترجمہ ہوا نہ ہو سکتا ہے۔

"THERE IS NO GOD BUT GOD."

سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ کارلائل کی یہ خدمت قبول فرمائے اور اس کی کوتاہیوں کو معاف فرمائے کتنی بڑی صداقت کا اعلان کر گیا، انگریز قوم کو اسلامی کلمہ دے گیا۔

(پیام شاہجہان پوری)

تمہید

مظاہر پرستی اور تاریک خیالی کے اس غیر مہذب دور سے جس میں شمالی یورپ کے ممالک سویڈن اور ناروے (۱) کے لوگ بری طرح مبتلا تھے اب ہم ایک ایسے مذہبی دور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کا ظہور بالکل ایک مختلف قوم میں ہوا ۔۔۔۔ یعنی عربوں میں اسلام کا ظہور ۔۔۔۔ اس طرح انسانی خیالات میں ایک عظیم تغیر اور بنی نوع انسان کے حالات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوتا ہے۔

وہ دور اب گزر گیا جس میں کسی بڑے انسان کو محض اس کی عظمت کی وجہ سے خدا کا درجہ دے دیا جاتا تھا۔ اب کسی بڑے انسان کو اس کے ہم جنس خدا نہیں مانیں گے جیسا کہ زیر بحث ہیرو (حضرت محمدؐ) کو خدا نہیں بلکہ من جانب اللہ نبی اور پیغمبر تسلیم کیا گیا۔ یہ بزرگوں کے احترام کی مختلف صورت ہے لیکن پہلا دور جس میں بڑے انسان (ہیرو) کو خدا مانا جاتا تھا اب کبھی واپس نہیں آ سکتا۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر عقل انسانی بجا طور پر سوال کرتی ہے کہ کیا کبھی ایسا ہوا بھی کہ نوع بشر کے کسی گروہ نے کسی ایسے شخص کو جسے انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے دیکھا تھا خدا مان لیا ہو؟ ایسا ممکن ہی نہیں۔ یہ تو ہوا کہ جب

---

(۱) کارلائل نے یہاں "اسکنڈے نیویننز" کی ترکیب استعمال کی ہے، ہم نے قارئین کرام کی سہولت کے لئے ان میں سے دو ممالک کے نام درج کر دیئے جن کا مجموعہ اسکنڈے نیویا کہلاتا تھا۔ (پیام)

ایک بڑا شخص دنیا سے چلا گیا تو اس کی بعض صفات عالیہ کی وجہ سے جو اس کے پیروکاروں کے ذہنوں میں محفوظ تھیں اسے خدا مان لیا گیا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا اور اب کبھی کسی بڑے سے بڑے (روحانی) انسان کو خدا کے طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

بلاشبہ یہ بہت ہی سفلہ پن اور حد درجہ جہالت تھی کہ لوگ ایک عظیم المرتبت انسان کو (اس کی عظمت کی وجہ سے) خدا سمجھ لیتے تھے۔ اس کے باوجود یہ ضرور ہے کہ ایسے شخص کے مرتبے کا تعین کرنے میں سخت دشواری پیش آتی رہی کہ آخر اسے کیا کہا جائے؟ اسے کس نام سے یاد کیا جائے کیونکہ ایسے (عظیم روحانی) انسان میں بعض الٰہی صفات بھی پائی جاتی تھیں۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں جب کوئی بڑا شخص پیدا ہوا تو اس کا خیر مقدم کس طرح کیا گیا؟ اسے کیا مانا گیا؟ اسے نبی مانا گیا؟ یا خدا؟ یا اسے کوئی اور درجہ دیا گیا؟ اسی سوال کے جواب میں ہم وہ دریچہ تلاش کر لیں گے جس میں سے اس عہد کے لوگوں کی اصل روحانی حالت نظر آ سکے گی بالفاظ دیگر ہم اس کی تہہ تک پہنچ سکیں گے۔ یوں بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر بڑا آدمی دست قدرت کا شاہکار ہونے کی وجہ سے ایک ہی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ میری رائے میں اوڈن (۱) (ODIN) لوتھر (۲) (LUTHER) جانسن (۳) (JOHNSON) برنس (۴) (BURNS) سب ایک ہی اصل (فطرت) کے شاہکار تھے۔ دنیا کی طرف سے ان کا خیر مقدم مختلف طریقوں سے کیا گیا؟ انہوں نے جو صورتیں اختیار کیں ان کی وجہ سے ان کے مراتب میں سخت تفاوت پیدا ہو گیا۔ ”اوڈن“ کے سامنے لوگوں کو سربہ سجود دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے۔ ایک انسان کا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا انسان ہو اتنا احترام؟ اس کی عقیدت میں اندھا ہو کر یہ سمجھ لینا کہ یہ عرش کا ساکن بلکہ خدا ہے بلاشبہ تعظیم و احترام کا یہ نہایت ناقص طریقہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ہم نے برنس جیسے جوہر قابل کا جس طرح استقبال کیا اور اس سے جو سلوک کیا (کہ اسے روٹیوں کا محتاج رکھا) کیا ہم اس طریق احترام کو کامل کہہ سکتے ہیں؟

آسمان سے زمین پر جو سب سے بڑی نعمت نازل ہوتی ہے وہ ایک غیر معمولی انسان کا ورود ہے لیکن افسوس کہ ہم اسے آتش بازی کا تماشہ سمجھ کر ضائع کر دیتے ہیں جو کچھ دیر شرربار ہوئی اور پھر جل جلا کر ختم ہو گئی۔ ایسے جلیل القدر انسان کے استقبال کا یہ طریق بھی میرے نزدیک کامل نہیں کہلا سکتا۔ بلاشبہ برنس جیسے (عظیم المرتبت) شخص کے ساتھ ناقدری کا یہ سلوک حد درجہ قابل مذمت تھا جس سے انسانی طور طریقوں کے ناقص ہونے کا ثبوت ملتا ہے، اس کے مقابلے میں اسکنڈے نیویا کے غیر متمدن لوگوں کا طریقہ بہتر تھا اگرچہ ایک انسان کی پرستش جاہلانہ عقیدہ تھا لیکن اس سے کہیں بدتر وہ غفلت ہے جو اپنے ہیرو کو جائز محبت سے بھی محروم کر

---

(۱) اوڈن، اسکنڈے نیویز اقوام کا بہت ہی محترم اور پاکباز شخص تھا جسے خدا بنا لیا گیا۔

(۲) لوتھر جس کا پورا نام مارٹن لوتھر تھا پروٹسٹنٹ فرقہ کا بانی تھا۔ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا اس نے مسیحیوں کو بت پرستی اور شرک سے باز رکھنے کے لئے اہم اور قابل قدر خدمات انجام دیں اس کی وفات ۱۵۴۶ء میں ہوئی۔

(۳) جانسن، پورا نام سیموئل جانسن ۱۷۰۹ء میں پیدا ہوا۔ انگریزی زبان کا بہت بڑا ادیب و شاعر اور لغت نویس تھا۔ ۱۷۸۴ء میں فوت ہوا۔

(۴) برنس، پورا نام رابرٹ برنس تھا۔ ۱۷۰۹ء میں بمقام اسکاٹ لینڈ پیدا ہوا۔ بہت بڑا شاعر و ادیب تھا۔ ۳۷ سال کی عمر پا کر ۱۷۹۶ء میں فوت ہو گیا، (یہ تشریح پروفیسر اعظم خاں کے ترجمے ”سید الانبیاء“ سے ماخوذ ہے)

دیتی ہے۔ اکابر کے احترام کا طریقہ بدلتا رہا ہے۔ اس کی صورتیں ہر عہد میں مختلف رہیں مگر کوشش کے باوجود صحیح مقام تک نہیں پہنچ سکیں۔

ہم نے (آج کی تقریر کے لئے) حضرت محمدؐ کا انتخاب اس لئے نہیں کیا کہ وہ افضل الانبیاء تھے (۲) بلکہ اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ (غیر مسلم ہونے کی وجہ سے) ہم ان کے بارے میں آزادی سے اظہار خیال کر سکیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی خوف نہیں کہ (میری تقریر سن کر) ہم میں سے کوئی شخص مسلمان ہو جائے گا۔

---

(۲) کارلائل مسیحی ہونے کی وجہ سے برملا اظہار نہ کر سکا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمام انبیاء سے افضل تھے اس صورت میں حضرت مسیحؑ کا مرتبہ کم ہو جاتا مگر آگے چل کر اس نے حضورؐ اقدس کے بارے میں جو انداز گفتگو اختیار کیا ہے اس سے یہی تاثر ابھرتا ہے کو خود اس کے خیال میں بھی روئے زمین پر آپؐ سے بڑا کوئی پیغمبر پیدا نہیں ہوا۔ (پیام)

کارلائل کو
قائداعظم کا خراجِ تحسین

”میں جب انگلستان میں طالب علم تھا اس وقت میں نے کارلائل کی اور کتابوں کے ساتھ اس کتاب (ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ) کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اسی وقت سے کلیسا کے اس مرد عاقل کی عظمت میرے دل میں جاگزیں ہے۔ اس نے ہمارے پیغمبر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حالات اور آپؐ کے کارناموں کی سچی تصویر کھینچ کر نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ساری دنیا کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔“

مخلص
(ایم اے جناح)
۲۶ اگست ۱۹۴۴ء
(مالابار ہل بمبئی)

(محمد اعظم خاں لیکچرر شعبہ ء اردو
جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)
کے نام خط سے اقتباس)

میری والدہ کا خواب

یہ اس وقت کی بات ہے جب میری مسیں بھیگ رہی تھیں، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں آگے بڑھ کر کیا کروں گا اور کیا بنوں گا، نہ مجھے دین سے کوئی رغبت تھی بلکہ چند سال کے بعد تو میرا یہ حال ہو گیا کہ مذہب کو بالکل غیر ضروری چیز سمجھنے لگا حتی کہ روح کا بھی منکر ہو گیا۔ اسی دوران میری والدہ مرحومہ نے جو نہایت نیک سرشت اور عبادت گزار خاتون تھیں ایک خواب دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ۔۔۔۔ "ہمارے دروازے پر ایک اونٹ آکر رکا ہے جس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تشریف فرما ہیں، آپؐ کے پیچھے یہ گنہگار تلوار لئے کھڑا ہے۔ حضورؐ اقدس اونٹ پر سے اترتے ہیں، ہمارے گھر میں تشریف لاتے ہیں، تلوار لئے میں بھی آپؐ کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوں۔"

علمائے امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جس خواب میں حضورؐ اقدس کی زیارت ہو اس میں کسی شیطانی وسوسے کا دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا، نہ ایسا خواب جھوٹا ہوتا ہے۔ الحمدللہ کہ وہ خواب آج پورا ہو گیا اور اس کتاب کے ذریعے سے مجھے اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اسلام کی مدافعت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ واقعہ صرف تحدیث نعمت کے طور پر بیان کر رہا ہوں۔ رب کریم میری اس خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین

خاک پائے رسولؐ اقدس
(پیام شاہجہانپوری)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نہایت ضروری

کارلائل کے ان افکار کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت ضرور پیش نظر رکھئے کہ یہ خیالات ایک مسیحی عالم اور مفکر کے ہیں اور آج سے قریباً" دو صدی قبل لندن کے ہال میں سامعین کے جس عظیم اجتماع کے سامنے وہ ان خیالات کا اظہار کر رہا تھا وہ اجتماع بھی مسیحیوں کا تھا جنہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اور اسلام سے قطعاً" ہمدردی نہ تھی بلکہ سخت مخالف تھے۔

کارلائل کو یہ بھی احساس تھا کہ یہ متعصب لوگ کہیں مشتعل نہ ہو جائیں اس لئے وہ ان کے جذبات کو بھی پیش نظر رکھ رہا تھا اور کبھی کبھی کوئی ایسا فقرہ بھی کہہ دیتا تھا جس سے ان کا جوش ٹھنڈا ہو جائے۔ اس کے باوجود اس نے اظہار حق کے معاملے میں بے مثال جرات سے کام لیا ہے۔

(پیامؔ)

پیغمبرِ صادق

(حضرت) محمد ﷺ کے پیغمبر صادق ہونے میں مجھے کوئی شبہ نہیں (اس لیکچر میں) میں آپ ﷺ کے وہ تمام اوصاف و کمالات بیان کرنے کی کوشش کروں گا جو ازروئے انصاف ممکن ہو سکتے ہیں۔ (حضرت) محمد ﷺ کی تعلیمات کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس عالم خاکی کو آپؐ کس طرح دیکھتے تھے؟ اسی کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جاسکے گی کہ دنیا کے لوگ آپ ﷺ کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔

حضورؐ اقدس کے بارے میں اہل یورپ کی بہتان طرازیاں

(ایک بات تو بالکل طے ہے کہ) ہم اہل یورپ کا (حضرت) محمد ﷺ کے بارے میں جو خیال پایا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے، یعنی یہ کہنا کہ آپ ﷺ (نعوذ باللہ) فریب کار، کاذب یا جھوٹ کا پیکر تھے اور جس مذہب سے آپ ﷺ نے دنیا کو روشناس کرایا (نعوذ باللہ) وہ صرف اور صرف دغابازی اور جہل پر مبنی تھا۔ یہ نہایت غلط خیال ہے۔ کذب اور تہمت تراشی کا یہ انبار تو خود ہم نے اس (پاک) وجود ﷺ کے بارے میں مذہبی جوش تعصب کی بنا پر جمع کر رکھا ہے جو خود ہمارے لئے باعث شرم ہے (اندازہ کیجئے کہ) ہم نے یہ کہانی گھڑی کہ (حضرت) محمد ﷺ نے ایک کبوتر سدھا رکھا تھا جب آپ ﷺ (اپنے کان میں مٹر کے دانے ڈالتے تھے تو وہ (اشارہ پاکر) یہ

دانے چننے کے لئے آبیٹھتا تھا اور (حضرت) محمد ﷺ (نعوذ باللہ) لوگوں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ کبوتر آسمان سے وحی لے کر اترا ہے۔ (۱)

حقیقت میں اب وقت آگیا ہے کہ (حضرت) محمد ﷺ کے بارے میں اس قسم کی بے اصل اور لغو باتوں کو (جو ہم نے اس پاک وجود کے بارے میں مشہور کر رکھی ہیں) ترک کر دیا جائے۔ یہ وہ ہستی ہے کہ اس کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوئے وہ آج بارہ سو سال بعد (۱۸۴۰ء میں) بھی دنیا کے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے لئے مشعل ہدایت و رہنمائی کا کام کر رہے ہیں۔ یہ اٹھارہ کروڑ انسان بھی اسی طرح دست قدرت سے تخلیق ہوئے ہیں جس طرح ہم۔ اللہ کے بندوں کی ایک بہت بڑی تعداد کسی اور ہستی کی بہ نسبت (حضرت) محمد ﷺ کے ارشادات کو آج بھی کہیں زیادہ قابل اعتماد سمجھتی ہے اور ان سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ ہم کیسے مان لیں کہ یہ سب روحانی بازی گری تھی اور یہ سارا سلسلہ حضرت محمد ﷺ کا محض ایک کھیل تھا جس پر کروڑوں انسان ایمان لائے اور اسے برحق سمجھتے ہوئے اس پر زندگی کے آخری لمحے تک قائم رہے اور اسی حالت میں دنیا سے گذر گئے؟ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو ایسے قیاس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اگر میں اسے تسلیم کر لوں تو مجھے بہت سی دور از عقل باتوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر دنیا میں

---

(۱) کارلائل کہتا ہے کہ انجیل کے مشہور انگریز عالم "ایڈورڈ پوکاک" (E.POCOCKE) نے جب اپنے ڈچ دوست اور ماہر دینیات "گروٹیس" (GROTIUS) سے اس کہانی کی حقیقت کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے اسے بالکل بے اصل قرار دیا۔

"HEROES AND HERO -WORSHIP", BY THOMAS CARLYLE

P-279(DENT:LONDON)1964 A.D.

مکر و فریب کو اس قدر پذیرائی نصیب ہو سکتی ہے تو خود اس دنیا کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ یہ امر فہم سے بالا ہے۔

جھوٹا مدعیٔ نبوت کامیاب نہیں ہوتا

ان لوگوں پر سخت افسوس ہوتا ہے جنہوں نے ایسے نظریات قائم کئے (کہ جھوٹے مذہب کا بانی بھی کامیاب ہو سکتا ہے) اگر ہم چاہتے ہیں کہ اشیائے کائنات کے بارے میں اصل حقائق ہمارے علم میں آئیں تو ہمیں ایسے (بیہودہ) نظریات کو یک قلم رد کر دینا ہو گا۔ یہ نظریات روحانی جمود کی پیداوار ہیں جو ایسے عالم میں پروان چڑھے جن میں روحانی موت واقع ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں ایسا ملحدانہ نظریہ آج تک شاید ہی دنیا کے پردے پر پیش کیا گیا ہو کہ ایک کاذب شخص بھی کسی سچے مذہب کا بانی ہو سکتا ہے؟ اپنے دعوے میں ایک جھوٹا (معمار) تو اینٹ اور چونے سے ایک مکان تک تعمیر نہیں کر سکتا جب تک اسے چونے، مٹی اور ان چیزوں کے خواص کا صحیح طور پر اور مکمل علم نہ ہو جو اس مکان کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں ورنہ اس کا تعمیر کیا ہوا مکان عمارتی سامان کا محض ایک بے ہنگم ڈھیر ہو گا، اسے مکان ہرگز نہیں کہا جا سکے گا۔ ایسا مکان بارہ صدیوں (یعنی حضور اقدس ﷺ کی بعثت سے کارلائل کے دور) تک ہرگز قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اس میں اٹھارہ کروڑ انسان رہ سکتے ہیں، ایسا مکان تو بنتے ہی زمین بوس جائے گا۔

(یاد رکھئے) قدرت ہمیشہ اسی شخص کا ساتھ دیتی ہے جو (راستباز ہوتا ہے اور) قانون قدرت کے مطابق عمل کرتا ہے، جسے اشیائے عالم کے حقائق کا پوری طرح علم ہوتا ہے۔ جو فطرت کے رازوں کا شناسا ہوتا ہے ورنہ فطرت اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دے گی۔ (اس میں شک نہیں کہ) بعض فریب کار لوگ منصب قیادت حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی فریب کارانہ حکمت عملی سے کام لے کر عارضی طور پر

کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن وہ جعلی نوٹ کی طرح ہوتے ہیں جسے وہ تو کیش کرا لیتے ہیں مگر اس کا نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے (۲) پھر انقلاب فرانس اور اسی نوعیت کے دیگر واقعات کی صورت میں قدرت کا تازیانہ حرکت میں آتا ہے اور نہایت سچائی کے ساتھ کھوٹے اور کھرے کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور پرکھنے والے پرکھ لیتے ہیں کہ اصلی ظاہر کئے جانے والے نوٹ دراصل جعلی تھے۔ یعنی ایک کاذب اور جعل ساز شخص کو صداقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا، لیکن (حضرت محمدؐ کی طرح) ہر عظیم انسان کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ وہ اپنے قول میں سچا ہوتا ہے بلکہ سچائی اس کی زندگی اور اس کے مشن کی بنیاد ہوتی ہے۔ (تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ) اس دنیا میں بڑے لوگوں نے جب بھی کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے انہوں نے ہمیشہ خلوص نیت کو نہ صرف پیش نظر رکھا بلکہ اس سے رہنمائی حاصل کی ہے (۳)، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ گہرا اور سچا خلوص وہ پہلی خصوصیت ہے جو ہر بڑے انسان میں ہونی چاہئے۔ مگر یہ ایسا خلوص نہیں ہوتا جو اپنی تعریف میں خود رطب اللساں ہو جائے۔ (یاد رکھئے) جس خلوص میں خود تعریفی اور خود نمائی کا جذبہ ہو وہ خلوص نہیں بلکہ تکبر ہے۔ بڑے انسان تو اپنے

خلوص کے بارے میں کوئی دعویٰ بھی نہیں کرتے بلکہ انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ان میں یہ اعلیٰ جذبہ موجود بھی ہے؟ انہیں تو اپنی (بشری) کمزوریوں کا احساس و اعتراف ہوتا ہے (گویا وہ عجز و انکسار کے پیکر ہوتے ہیں) کیونکہ دنیا میں ایسا کون سا شخص پیدا ہوا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ قانون صداقت کی پوری پابندی کرتے ہوئے گذارا ہے (کہیں نہ کہیں اس سے چوک ہو ہی جاتی ہے) اس کے خلوص نیت اور اس کی صداقت شعاری کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کسی منصوبے کے تحت اختیار کی ہے بلکہ یہ اس کی فطرت کا جزو ہوتی ہے گویا وہ ایسا شخص ہوتا ہے جو صادق ہوئے بغیر رہ سکتا ہی نہیں۔

وجود باری کا مظہر ﷺ

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ میرے خیال میں مرد عظیم (ہیرو) کی سب سے پہلی اور بڑی خصوصیت یہ ہے (کہ وہ فطرۃ" راستباز اور صادق ہوتا ہے) اگرچہ یہ کمالات صدق ایک عام شخص میں بھی پائے جا سکتے ہیں لیکن مرد عظیم میں ان کا پایا جانا تو قطعی اور لازمی ہے۔ ایسے شخص ہی کو "اصل انسان" کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے سے پہلے گذرے ہوئے کسی انسان کی نقل نہیں ہوتا۔ اسے ایسا نامہ بر کہنا چاہئے جو پردۂ غیب سے دنیا میں بھیجا گیا تاکہ وہ الٰہی پیغام ہم تک پہنچا سکے (جیسا کہ حضرت محمدؐ تھے) اس کی زبان پر جو الفاظ جاری ہوتے ہیں ان کا مثل نوع انسانی میں سے کوئی شخص پیش نہیں کر سکتا (یعنی کوئی شخص از خود ایسے الفاظ تخلیق کرنے پر قادر ہی نہیں ہو سکتا) وہ حقیقت اشیاء کی روح اور اس کا رازداں ہوتا ہے اور اس کے شب و روز اسی کی توضیح و تشریح میں بسر ہوتے ہیں۔ اوہام اس کے اور حقائق کے درمیان حائل نہیں ہو سکتے۔ وہ بیمار ہو یا مبتلائے مصائب (خاموش ہو یا) گویا، حقیقت ابدی ہر لمحہ اس کے سامنے ضوفشاں رہتی

---

(۲) یہاں کارلائل ایک اطالوی کیمیاگر (CAGLIOSTROS) کا حوالہ دیتا ہے جس نے اپنی عیاری اور جعل سازی سے لوگوں کو فریب دیا، اس نے جعلی اشیاء تیار کیں اور لاکھوں روپیہ لوٹا آخر اس کی جعل سازی کھل گئی وہ گرفتار ہوا، جرم ثابت ہونے پر پہلے موت کی سزا ہوئی پھر عمر قید کی۔

"HEROES AND HERO-WORSHIP.P-280

(۳) یہاں کارلائل یورپ کی چار بڑی صاحب عزم شخصیتوں مرابو برنس، نپولین اور کرامویل کے نام بطور مثال پیش کر کے کہتا ہے کہ جب تک سچا جوش و جذبہ موجود نہ ہو کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ (پیام)

ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اسے مکاشفات (وحی) کے سوائے اور کیا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس پر جو کچھ نازل ہوتا ہے اسے کوئی نام دینے کے لئے ہمارے پاس (وحی) کے سوائے اور کوئی لفظ نہیں ہے۔ (بلاشبہ) ایسا شخص قلب کائنات سے ابھرتا ہے اور اس کا وجود حقیقت اشیاء کا بنیادی جزو ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں (بہت سی ہستیوں پر) الہامات نازل ہوئے لیکن کیا یہ ہستی (حضرت محمد ﷺ) وجود باری کا ایسا مظہر نہیں تھا جو تازہ ترین بھی ہے اور آخری بھی۔ یہ ایسا وجود تھا جس کی عقل نے وحی کی پرورش گاہ میں پرورش پائی ہے پس آیئے سب سے قطع نظر کر کے اس کی طرف متوجہ ہوں اور دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔

پیغمبر صدق

(حقیقت یہ ہے کہ) ہم حضرت محمد ﷺ کو کسی طور بھی حرص و ہوا کا بندہ نہیں کہہ سکتے اور نہ منصوبہ ساز قرار دے سکتے ہیں۔ نہ وہ ظاہریت و نمائش محض تھے، نہ ہی (یورپ کے بعض مصنفوں کی طرح) ہم آپ ﷺ کی تعلیمات و فرمودات کو جہل و نادانی کے مجموعے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک امی کی حیثیت سے آپ ﷺ جو پیغام لے کر دنیا میں آئے تھے وہ صدق ہی صدق تھا۔ وہ ایک ایسی آواز تھی جو پردۂ غیب سے پرفشاں ہوئی۔ نہ تو اس ہستی کے اقوال جھوٹے تھے اور نہ اس کے فعل میں کھوٹ تھی۔ وہ نمود و نمائش سے پاک و منزہ اور بڑی عالی ظرف ہستی تھی۔ وہ حیات و کائنات کا ایک جلوۂ تاباں تھا جو سینۂ فطرت سے ضوفشاں ہوا۔ یہ وہ جلوۂ تاباں تھا جسے خالق کائنات نے اپنی کائنات میں نور بکھیرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ (۴)

---

(۴) اس کے بعد کارلائل حضرت داؤدؑ سے بار بار گناہ سرزد ہونے کا حوالہ دے کر یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر (حضرت) محمدؐ سے بھی کبھی کوئی لغزش ہو گئی ہو تو اس سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آتا، حالانکہ

سرے سے یہ بات ہی غلط ہے۔ حضرت داؤدؑ نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ قرآن انہیں پاک پیغمبر قرار دیتا ہے۔ یہ بائیبل نویسوں کی بہتان طرازیاں ہیں۔ کارلائل چونکہ مسیحی تھا اس لئے یہ کہنے کی جرات تو نہ کر سکا کہ بائیبل میں اس قسم کی بے سروپا باتیں بھی درج ہیں۔ خدا کے بندے نے بائیبل کی عظمت بچانے کی خاطر خدا کے مقدس پیغمبر کی عظمت کا داغدار ہونا گوارا کر لیا۔ (پیام)

حضورِ اقدس کا وطن

ہمیں یقین ہے کہ حضرت محمد ﷺ جو پیغام لے کر آئے تھے وہ صدق و راستی پر مبنی تھا۔ آیئے معلوم کریں کہ وہ پیغام تھا کیا؟ (مگر پہلے تھوڑی سی تفصیل اس ملک اور قوم کی جس میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے)

عرب قوم جس میں (حضرت) محمد ﷺ نے آنکھ کھولی غیر معمولی خصوصیات کی حامل قوم تھی بلکہ اس قوم کی طرح وہ ملک بھی غیر معمولی خصوصیات کا حامل ہے جس میں اس قوم کی بود و باش تھی، دراصل ایسی قوم کے لئے ملک بھی ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اور ایسے ملک ہی میں اسے رہنا چاہئے تھا۔ خشک اور ہر قسم کے سبزے سے محروم پہاڑ جن میں آمد و رفت کا راستہ تک نہیں تھا' درمیان میں بڑے بڑے ڈراؤنے ریگستان جن میں اتفاق ہی سے کہیں کوئی سبز قطعہء اراضی نظر آجاتا ہے' جہاں کہیں پانی ہوتا ہے وہاں کچھ حسن ہے کچھ شادابی ہے' لوبان اور مہندی کے خوشبودار درخت ہیں کھجوروں کے باغات ہیں۔ ذرا تصور تو کیجئے اس لق و دق ریگستان کا جہاں حد نگاہ تک ریت کے سمندر کے سوائے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا اور جہاں چاروں اطراف میں ہر وقت ایک مہیب سکوت اور (دہشت ناک) سناٹا طاری رہتا ہے۔ یہ مہیب ریگستان دور دور واقع آبادیوں میں حد فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں انسان بھری دنیا میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرتا ہے۔ یہاں دن میں تو سورج ناقابل برداشت آگ برساتا ہے اور رات کو چرخ نیلی فام ستاروں

سے جگمگا اٹھتا ہے۔

عربوں کے فطری خواص

(سچی بات یہ ہے کہ) اس (ہیبت ناک) ماحول میں ایسی ہی قوم رہ سکتی ہے جس کے افراد مضبوط اور پھرتیلے جسم کے مالک ہوں اور جن کی طبائع میں وہ گہرائی ہو جو عربوں میں پائی جاتی ہے۔ عرب اپنی فطرت کے اعتبار سے بے حد مستعد اور چالاک ہوتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان میں غور و فکر کی بھی عادت ہوتی ہے اور وہ جوش و خروش سے معمور ہوتے ہیں (یہاں یورپ میں) ایرانیوں کو (ان کی عادات و اطوار کی وجہ سے) "مشرقی فرانسیسی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہم عربوں کو "مشرقی اطالوی" کہیں گے۔ وہ (عرب) بہت بلند فطرت ہوتے ہیں۔ جذبات میں حد درجہ تیزی و تندی کے باوجود انہیں اپنے جذبات پر غیر معمولی قابو بھی حاصل ہوتا ہے جس سے ان کی شرافت نفس اور بلندیء فطرت ظاہر ہوتی ہے۔

(ذرا غور تو کیجئے کہ) ایک غیر متمدن بدو ایک نووارد (مہمان) کو اس طرح خوش آمدید کہتا ہے جیسے وہ اس بدو کے خیمے میں موجود ہر چیز کا حق دار ہے۔ یہ نووارد خواہ اس کا سخت ترین دشمن ہی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ اس کے لئے اپنے جانوروں میں سے اچھا سا جانور ذبح کر کے اس کی خاطر مدارات کرے گا۔ تواضع کا یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہے گا جسے وہ اپنا مقدس فرض سمجھ کر ادا کرے گا پھر اسے رخصت کر دے گا (لیکن خیال رہے کہ اس کے بعد کچھ آگے جا کر (جب اس کا مہمان اس کی حدود سے نکل جائے گا) تو اسے قتل کرنے میں بھی باک محسوس نہیں کرے گا کیونکہ اس کا قبائلی قانون اسے اس فعل کا حق دیتا ہے' یہ قانون بھی اس کے لئے قانون مہمان نوازی کی طرح مقدس ہے۔

عرب لوگ چرب زبان اور باتونی نہیں ہوتے بلکہ کم سخن ہوتے ہیں مگر

(بوقت ضرورت) جب بولنے پر آتے ہیں تو فصاحت ان کے سامنے دست بستہ کھڑی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ پیکر اخلاص اور نہایت راست گفتار ہوتے ہیں۔ نسلی اعتبار سے ان کی اور یہودیوں (بنی اسرائیل) کی اصل ایک ہی ہے (یعنی دونوں حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں) مگر اس کے باوجود ان میں یہودیوں کی سی مکروہ سنجیدگی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ بہت خوش طبع اور دلکشی کا پیکر ہوتے ہیں (مشہور مستشرق اور قرآن کریم کے مترجم) جارج سیل نے (عربوں کے ذوق شعرو سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے) لکھا ہے کہ ظہور اسلام سے قبل یہاں محافل شعرو سخن منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں لوگ کثیر تعداد میں شرکت کرتے تھے۔ یہ محافل شعر (نواح مکہ کے) مشہور بازار "عکاظ" میں سالانہ میلے کے موقع پر برپا ہوتی تھیں (جہاں دور دور سے تاجر سامان تجارت لے کر آتے تھے) اور خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ لوگ شعرو سخن کی ان مجالس (مشاعروں) میں بھی شریک ہوتے تھے یہاں شاعر اپنا کلام سناتے تھے اور قدر دانان سخن سے انعام پاتے تھے۔

عربوں کی مذہبیت

(گذشتہ سطور میں ہم نے عربوں اور یہودیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ نسلی اعتبار سے ایک ہی اصل سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی عادات و اطوار میں یہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں مگر اس کے باوجود) عربوں میں یہودیوں (بنو اسرائیل) کی ایک صفت ضرور پائی جاتی ہے جو تمام صفات سے اعلیٰ ترین ہے' وہ ہے ان کی مذہبیت۔ اپنے عقیدے کی حد تک یہ بہت سخت مذہبی ہوتے ہیں ان میں یہ وصف زمانہ ٔ قدیم سے موجود ہے۔ صائبین کی طرح ستاروں کی پرستش کے علاوہ بہت سے مظاہر قدرت کی پرستش ان کے ہاں جاری رہی۔ ان مظاہر

قدرت کو انہوں نے صفات الٰہی قرار دے کر ان کی عبادت کی جو درست نہ تھا۔ (ا)

مختصر یہ کہ عرب کے ہر قبیلے میں ایسے مذہبی پیشوا پیدا ہوئے جو اپنے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو اپنی اپنی استعداد اور سوچ کے مطابق مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے اس کے باوجود ان کے سینے تقویٰ و

(ا) "اس کے بعد کارلائل عربوں کی اس مظاہر پرستی کے لئے جواز تلاش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم عربوں کی مظاہر پرستی کو سرتا سر غلط بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ تمام اشیاء ایک اعتبار سے اس کی قدرت کا مظہر ہی تو ہیں اور کیا ہم آج بھی ان مظاہر قدرت کی عظمت کو تسلیم کرنا ایک بڑی خوبی قرار نہیں دیتے جس کے لئے ہم "شاعرانہ حسن" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ ایک شاعر کی بھی تو عزت و تکریم کی جاتی ہے کیونکہ وہ شعر تخلیق کرتا ہے۔ اس عزت و تکریم میں بھی تو پرستش کی ہلکی سی جھلک موجود ہے۔"

یہ کارلائل کے ذاتی خیالات ہیں جو ایک موحد اور خدا پرست کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ بات عقلاً" بھی غلط ہے کہ ہر خوبصورت اور قابل قدر چیز کی اس طرح پرستش شروع کر دی جائے جس طرح خدا کی پرستش کی جاتی ہے جو ان اشیاء کا خالق ہے۔ عقلاً" تو پرستش کا مستحق وہ قادر مطلق اور خلاق کل ہوا جس کے دست قدرت سے یہ اشیاء صورت پذیر ہوئیں اور اس کی محتاج ہیں۔ عاجز اور محتاج چیزوں کو قابل پرستش قرار دینا ہی تو بت پرستی اور جہالت ہے (پیام)

پرہیز گاری اور شرافت نفس کے جذبات سے مملو تھے (۲)

خانہ ء کعبہ کی عظمت

زمانہ ء قدیم کے عرب بت پرستوں میں جو چیزیں قابل پرستش تھیں ان میں ایک حجراسود بھی تھا جو آج بھی ایک عمارت میں نصب ہے یہ عمارت کعبہ کہلاتی ہے اور شہر مکہ میں واقع ہے۔ یہ کعبہ بھی بڑی عجیب عمارت ہے جو آج بھی ایک سیاہ غلاف اوڑھے سینہ ء ارض پر ایستادہ ہے۔ یہ غلاف ترکیہ کا سلطان ہر سال بھیجتا ہے تاکہ (پہلا غلاف اتار کر یہ تازہ غلاف) کعبہ کی عمارت پر چڑھا دیا جائے۔ کعبہ کی بلندی ستائیس ہاتھ ہے اور یہ دو ستونوں کے حلقوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس عمارت کو جھاڑ فانوس اور بیش قیمت سامان آرائش سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ یہ فانوس آج بھی شام ہوتے ہی روشن کر دیئے جائیں گے اور ستاروں سے مزین آسمان کے نیچے ساری رات روشنی بکھیرتے رہیں گے۔ مختصر یہ کہ قدیم دور کی یہ ایک محترم یادگار ہے۔ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا قبلہ ہے اور دہلی سے مراکش تک کے بے شمار عبادت گذاروں کی نظریں دن اور

رات میں پانچ بار اس کی طرف اٹھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کے چاروں کونوں میں آباد مسلمانوں کا یہ سب سے مقدس مرکز ہے۔ عرب کے تمام قبائل ہر سال حجر اسود اور چاہ زمزم کی زیارت کی غرض سے مکہ میں آیا کرتے تھے۔ چاہ زمزم کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہی کنواں ہے جو حضرت ہاجرہؑ نے مکہ میں دریافت کیا تھا اور انہی چیزوں کے تقدس کی وجہ سے مکہ کو بھی ایک (بڑے) شہر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

مکہ اور اس کی اہمیت

ایک زمانے میں مکہ بہت بڑا شہر تھا۔ مگر اب (۱۸۴۰ء میں) یہ شہر ویران پڑا ہے کیونکہ یہ اس صلاحیت سے محروم ہے جو کسی جگہ کے شہر بننے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ مکہ ساحل سمندر سے کوسوں دور خشک پہاڑوں کے درمیان ایک ایسے نشیب میں واقع ہے جس کی زمین ریتلی ہے۔ یہاں اناج تک پیدا نہیں ہوتا اور یہ بھی باہر سے منگوایا جاتا ہے (جب اس سرزمین کو چاہ زمزم اور کعبہ کی وجہ سے تقدس حاصل ہوا تو یہاں) زائرین کی آمد و رفت شروع ہوئی یہ ایک قدرتی بات ہے کہ مقدس مقامات جہاں زائرین کی آمد و رفت ہوتی ہے رفتہ رفتہ تجارتی مرکز بن جایا کرتے ہیں کیونکہ زائرین کی آمد کے ساتھ ساتھ ہی تاجر بھی آ پہنچتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں لوگوں کے قیام اور ان کی کثرت کی وجہ سے سامان خورونوش اور دیگر اشیائے زندگی کی ضرورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے لامحالہ تاجروں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ پس مکہ رفتہ رفتہ ایک طرف تو سارے عرب کا مقدس مرکز بن گیا اور دوسری طرف اسے تجارتی منڈی کی بھی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ہندوستان، مغربی ممالک اٹلی، شام اور مصر وغیرہ کے درمیان اس نے ایک بڑے تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی۔

---

(۲) اس کے بعد کارلائل بائبل کی کتاب "ایوب" کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے "یہ کتاب مقدس بھی اسی سرزمین عرب کے سینے پر تخلیق ہوئی جس سے انجیل کے تنقید نگار بھی متفق ہیں اور اسے سرزمین عرب کا ہی تحفہ قرار دیتے ہیں"۔ کارلائل کتاب "ایوب" کو حضرت ایوبؑ کی ایک ایسی تخلیق قرار دیتا ہے "جس میں زور قلم حد کمال کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے، جس میں فرقہ پرستی اور گروہ بندی کی بجائے ہمہ گیری پائی جاتی ہے اور یہ ہرگز عبرانی کتاب معلوم نہیں ہوتی۔ یہ کتاب بے نظیر تشبیہات و استعارات، طرزبیان کی دل آویزی اور اپنی ترنم ریزی میں بے مثل ہے اور اس کی صداقت کی خوبیاں احاطہ ء بیان سے باہر ہیں" (بقول کارلائل)

ایک زمانہ میں مکہ کی آبادی ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جس میں خریدار اور تاجر دونوں شامل تھے جہاں مشرقی اور مغربی اشیائے پیداوار کالین دین ہوتا تھا۔ مکہ میں ایک خاص طرز کا بے قاعدہ سا جمہوری نظام قائم تھا جس میں مذہب کا پرتو بھی نظر آتا تھا۔ مکہ کی حکومت اور کعبہ کی تولیت کسی بڑے قبیلے کے دس افراد کے ہاتھوں میں دیدی جاتی جنہیں اگرچہ منتخب کیا جاتا تھا مگر یہ انتخاب کسی خاص قاعدے کا پابند نہ تھا۔ (ہمارے ہیرو) حضرت محمد ﷺ کے عہد میں عربوں کا قبیلہ قریش سب سے ممتاز سمجھا جاتا تھا اور آپ ﷺ کے خاندان کا اسی قبیلے کی ایک شاخ (بنو ہاشم) سے تعلق تھا۔ باقی عرب جو ریگستانوں میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اسی نوعیت کی غیر منظّم حکومت کے تحت زندگی گذار رہے تھے جس کی باگ ڈور ایک یا ایک سے زیادہ سرداران قبائل کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔

یہ قوم چرواہوں، گلہ بانوں، مزدوروں (کاشتکاروں اور تاجروں پر) مشتمل تھی حتیٰ کہ ڈاکو بھی اس قوم کا ایک جزو تھے۔ یہ سب اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتے تھے جن کے درمیان کوئی اتحاد نہ تھا سوائے اس اجتماع کے جو کعبہ کی زیارت (حج) کے موقع پر منعقد ہوتا تھا۔ ان کے درمیان زبان اور نسل کی وجہ سے جو ناقابل تقسیم یکسانیت تھی وہ کعبہ کے اجتماع کے موقع پر انہیں ایک مقام عبادت پر یک جا کر دیتی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے عرب لوگ نگاہ عالم سے چھپے ہوئے ایک ایسے زمانے کے انتظار میں تھے جو انہیں ساری دنیا کی نگاہوں کی توجہ کا مرکز بنانے والا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں یہودا کی ایک لاہوتی ہستی (حضرت عیسیٰؑ ابن مریمؑ) کی ولادت کی وجہ سے جو (روحانی) تغیر پیدا ہو گیا تھا اس کا اثر قبائل عرب پر بھی پڑا تھا اور ان کی بت پرستی میں تزلزل آ گیا تھا اور ان میں ایک ہیجان کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

حضورؐ اقدس کی ولادت

یہ تھے وہ حالات جب عرب کے ان باشندوں کے درمیان ۵۷۰ء میں (حضرت) محمد ﷺ کی ولادت ہوئی۔ آپ ﷺ کا تعلق عربوں کے قبیلہ ء قریش کی شاخ (بنو) ہاشم سے تھا۔ اگرچہ یہ لوگ متمول نہ تھے لیکن مکہ کے اکثر متمول سرداروں سے ان کی رشتہ داریاں تھیں۔ ابھی آپ ﷺ شکم مادر ہی میں تھے کہ آپ ﷺ کے والد مکرم کا انتقال ہو گیا۔ چھ برس کے تھے کہ آپ کی والدہ محترمہ بھی رحلت فرما گئیں جو اپنے حسن سیرت، جمال صورت، اپنے تدبر و فراست اور معاملہ فہمی میں بہت ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ اب آپ ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب آپ کے سرپرست و مربی بنے جو اس وقت سو برس کے ہو چکے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کے والد جناب عبداللہ حضرت عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے تھے۔ اس پیر صد سالہ نے دیکھا کہ اس نوزائیدہ بچے میں اس کے بیٹے (حضرت عبداللہ) کے نقوش جھلک رہے ہیں وہ اس در یتیم کو غیر معمولی طور پر چاہنے لگے۔ وہ (حضرت عبدالمطلب) کہا کرتے تھے کہ بنو ہاشم کو اس گوہر یکتا (حضرت محمد ﷺ) کی حفاظت کرنی اور اس کا بہت خیال رکھنا چاہئے کیونکہ آج تک ان میں کوئی ایسا در بے بہا پیدا نہیں ہوا۔ (۱) مگر دو سال گذرے تھے کہ پیر صد سالہ

---

(۱) حضورؐ اقدس ﷺ کی ولادت سے قبل آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت سیدہ آمنہؓ نے جو رویا دیکھے تھے اور بعض اوقات آپؓ پر جو کشفی حالت طاری ہوئی تھی ان رویا و کشوف میں سیدہ آمنہؓ کو

(باقی اگلے صفحے کے حاشیہ پر)

حضرت عبدالمطلب بھی وفات پا گئے اور اب آپ ﷺ کی تربیت و کفالت ابو طالب کے سپرد ہوئی جو آپ ﷺ کے سب سے بڑے چچا اور خاندان کے سب سے بڑے بزرگ ہونے کے علاوہ بہت صاحب عقل و فراست اور منصف مزاج شخص تھے۔ قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابو طالب نے حضرت محمد ﷺ کی پرورش اور تربیت بہت عمدہ عربی طرز پر کی۔

حضورؐ اقدس کے سفر

جب آپ ﷺ نے شعور کی منزل میں قدم رکھا تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ متعدد سفر کئے ان میں سے بیشتر سفر تجارتی اغراض کے تحت تھے۔ آپ ﷺ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی جب آپ ﷺ نے عربوں کی ایک جنگ (جنگ فجار) میں شرکت فرمائی۔ اس واقعے سے چند سال قبل آپ ﷺ نے شام کی طرف جو سفر اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ کیا تھا اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس طرح آپ ﷺ کی زندگی میں پہلا موقع آیا کہ آپ ﷺ نے بیرونی دنیا کو دیکھا اور (بعض مسیحی مصنّفین کے بقول) اس جدید مذہب سے آگاہی حاصل کی جو آپ ﷺ کے لئے بہت اہمیت کا حامل ثابت ہوا یعنی مذہب عیسوی۔ یہ روایت جس طرح بیان کی جاتی ہے وہ یوں ہے کہ حضرت محمد ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کے ایک عیسائی عالم اور راہب "سرجیس نسطوری" کے مکان پر فروکش ہوئے تھے جو عیسائیوں کے نسطوری فرقے سے تعلق رکھتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس مسیحی عالم (راہب) نے حضرت محمد ﷺ کو مسیحی مذہب کی تعلیم دی۔ (کارلائل اس روایت کو درست تسلیم

ایک مقدس اور عظیم فرزند کی بشارتیں دی گئی تھیں جو یقیناً حضرت عبدالمطلب کے علم میں ہوں گی۔ انہی بشارات کی بنا پر حضرت عبدالمطلب نے حضور ﷺ اقدس کو گوہر یکتا قرار دیا تھا۔ (پیام)

نہیں کرتا اور اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ) یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے کم سن بچے کو ایک راہب کیسے تعلیم دے سکتا ہے (وہ کہتا ہے کہ میرا خیال ہے کہ) نسطوری راہب کے اس واقعے میں بے حد مبالغے سے کام لیا جاتا ہے (ہمیں غور کرنا چاہئے کہ) جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت محمد ﷺ کی عمر چودہ سال کے قریب تھی، آپ ﷺ عربی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان بھی نہیں جانتے تھے اس لئے آپ نے شام میں جو کچھ دیکھا ہو گا وہ آپ ﷺ کی اس وقت کے فہم اور سمجھ سے بالا ہو گا (اس لئے آپؐ اس سے کوئی استفادہ نہ کر سکے ہوں گے) لیکن اس میں شک نہیں کہ اس وقت شام میں آپؐ نے جن چیزوں کا مشاہدہ کیا ان کا عکس آپ ﷺ کے ذہن میں محفوظ ہو گیا ہو گا۔ (۲)

پیغمبر امی

حضرت محمد ﷺ کے سلسلے میں ایک اور بہت ضروری بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ آپ کسی مکتب یا مدرسے کے تعلیم یافتہ نہ تھے (جس طرح آج کل درس گاہوں میں تعلیم کا رواج ہے) عرب کی سرزمین پر مدارس نہ تھے نہ عربوں میں تحریر کا رواج تھا۔ عربوں میں لکھنے کا (عام) رواج حضرت محمد ﷺ کے دعویٰ نبوت اور آپ ﷺ کی کامیابیوں کے زمانے میں شروع ہوا پس لوگوں کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ آپ ﷺ کی تعلیم کا کل اثاثہ ریگستانی

---

(۲) یہاں پہنچ کر کارلائل بعض مسیحی مصنفوں کے اس خود ساختہ نظریئے کا اظہار کرتا ہے کہ شام میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ آپ ﷺ کی آئندہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ بالکل غلط خیال ہے نہ واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ کوئی ادنیٰ سی عربی روایت بھی اس کے حق میں نہیں جاتی۔ (پیام)

زندگی اور اس کے تجربات تھے۔ کیسی تعجب انگیز بات ہے جو انسان کو حیرت زدہ کر دیتی ہے کہ آپ ﷺ کتابی علم سے مطلق بہرہ ور نہ تھے اور آپ ﷺ کے پاس معلومات کا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا سوائے اس مشاہدہ کے جو آپؐ اپنے گردوپیش سے اخذ کرتے تھے یا کچھ خبریں جو ادھر ادھر سے آپ ﷺ تک پہنچ جاتی تھیں وہ آپ ﷺ کی معلومات کا ذریعہ ہو سکتی تھیں۔ آپ ﷺ اس ذخیرۂ علم سے قطعاً" استفادہ نہیں کر سکتے تھے جو آپ ﷺ سے دور اکناف عالم میں بکھرا ہوا تھا اور نہ آپ ﷺ کے لئے یہ ممکن تھا کہ آں جنابؐ سے قبل جو انبیاء مبعوث ہوئے تھے ان کی تعلیم سے آگاہی حاصل کر کے اپنی فکر کو روشن کرتے۔ پس آپؐ ریگ صحرا کی وسعتوں میں یکہ و تنہا رہے اور درس گاہ فطرت اور اپنے خیالات کی دنیا میں نشوونما اور تربیت پاتے رہے۔ (علاوہ ازیں یہ بات بھی بہت قابل لحاظ ہے کہ عرب مورخین کے بیان کے مطابق) آپ ﷺ میں ابتدائے عمر ہی سے غور و فکر کی عادت تھی۔

حضور اقدس ﷺ کے اخلاقی کمالات

آپؐ کے دوست اور شناسا آپؐ کو "امین" کے لقب سے یاد کرتے تھے کیونکہ آپؐ سرتاپا صدق و صفا تھے۔ آپ ﷺ کے قول و فعل دونوں سے صداقت ٹپکتی تھی اور آپ ﷺ کا ہر خیال راستی پر مبنی ہوتا تھا۔ آپ ﷺ سے گفتگو کرنے والے محسوس کرتے تھے کہ آپ ﷺ کا ہر قول معنی سے لبریز ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کم سخن واقع ہوئے تھے، بے ضرورت گفتگو کرنا آپ ﷺ کی عادت کے خلاف تھا لیکن جب بھی کلام کرتے تو وہ بہت پر حکمت اور مدبرانہ ہوتا جس سے خلوص ٹپکتا تھا۔ آپ ﷺ کی گفتگو نفس مضمون تک محدود رہتی (یعنی غیر متعلق اور دور از کار باتیں آپ کی گفتگو میں دخل نہ پاتیں) درحقیقت ایسا ہی کلام اس قابل ہوتا ہے جس سے زبان کو آراستہ کیا جائے اور اسے لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے (تاکہ اس سے وہ

اپنی عقل و فکر کے لئے روشنی حاصل کر سکیں) شاید یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ ساری زندگی لوگوں میں ایک متین و سنجیدہ، راستباز اور بنی نوع انسان سے محبت کرنے والے کی حیثیت سے پہچانے جاتے رہے۔ اس کے باوجود کہ آپ ﷺ کی فطرت میں خلوص اور سنجیدگی تھی آپ ﷺ بہت متواضع بھی تھے، ملنسار تھے، نہایت خوش مزاج تھے اور اس قابل تھے کہ لوگ آپ سے دوستی کریں۔ آپ ﷺ کے چہرے پر دل کو موہ لینے والا تبسم نمایاں رہتا تھا جبکہ بعض لوگوں کی ہنسی میں بھی ریاکاری ہوتی ہے اور وہ صحیح طور پر ہنس بھی نہیں سکتے۔

حسن صورت و سیرت کا مرقع

حضرت محمد ﷺ کی ایک صفت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نہایت حسین و جمیل انسان تھے، حسن و جمال کا پیکر۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کے چہرے سے حسن کے علاوہ ذکاوت و ذہانت اور دیانت بھی ٹپکتی تھی، آپ ﷺ کا رنگ گندم گوں تھا، آنکھیں بہت روشن تھیں اور پتلیاں سیاہ (یعنی آپؐ کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی) مجھے تو آپؐ کی (روشن) پیشانی کی اس ہلالی شکل کی رگ پر بھی پیار آتا ہے جو خفگی کی حالت میں ابھر کر سرمئی ہو جاتی تھی۔ یہ بنو ہاشم کے خاندان والوں کی ایک مخصوص نشانی تھی جو آپ ﷺ کی پیشانی پر بھی نمایاں ہو جاتی تھی۔ آپ ﷺ (نہایت عالی حوصلہ) بلند عزم اور پر جوش ہونے کے باوجود منصف مزاج اور صداقت شعار واقع ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ آپ ﷺ نہایت جوش و حرارت کے ساتھ سینۂ صحرا پر اپنا کارنامۂ حیات مرتب کر رہے تھے۔

حضورؐ اقدس کی شادی

یہی وہ دور تھا جب (مکہ کی) ایک مالدار خاتون سے آپؐ کا تعارف ہوا جن کا نام

خدیجہؓ تھا۔ یہ خاتون بیوہ تھیں اور تجارت کرتی تھیں۔ حضور اقدس ﷺ ان کا سامان تجارت لے کر دو بار شام تشریف لے گئے اور اپنے فرائض کو جو آپ ﷺ کے سپرد کئے گئے تھے نہایت دیانت، ذمہ داری اور مستعدی سے ادا کیا اور حضرت خدیجہؓ سے خراج تحسین وصول کیا۔ عرب مورخوں نے آنحضرت ﷺ کی شادی کے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں (یہ مورخین کہتے ہیں کہ) آپ ﷺ کی عمر پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ چالیس سال کی ہو چکی تھیں مگر اس کے باوجود ان کے چہرے پر حسن و جمال موجود تھا۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس محسن بیوی سے آپ ﷺ کے تعلقات نہایت خوشگوار اور انتہائی محبت آمیز تھے۔ ان کی زندگی کے آخری لمحے تک آپ انہیں سچے دل سے چاہتے رہے اور کسی دوسری خاتون کو اپنی توجہ اور محبت کا مرکز نہیں بنایا۔

رُوحِ پاک

یہاں کارلائل رسول اقدس ﷺ کے دعوئ نبوت کی صداقت پر ایک عجیب دردمندانہ دلیل پیش کرتا ہے جو ہر منصف مزاج انسان کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

حیات قدسی کا لطیف پہلو

(کیا یہ عجیب بات نہیں کہ) حضرت محمد ﷺ نے اپنے جوش شباب کا زمانہ تو نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ گذار دیا (اس دور میں جب انسان کی آرزوئیں جوان ہوتی ہیں آپ ﷺ نے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوئی معمولی سی کوشش بھی نہیں کی) چالیس سال کی عمر تک آپ ﷺ نے اپنے بارے میں کسی قسم کا کوئی دعوئ نہیں کیا نہ نبوت کا دعوئ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی نیت میں کسی قسم کا مکر و فریب نہ تھا (کیونکہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہوتا تو نوجوانی کے آغاز ہی سے اس کے لئے پلاننگ کرتے اور خود کو لوگوں سے متعارف کرنے کی غرض سے گراؤنڈ تیار کرتے) حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کی عام عادت کے برعکس جو اہم اور بڑے واقعات رونما ہوئے وہ سب حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ظاہر ہوئے جب آپ ﷺ کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی، اس وقت تک آپ ﷺ میں اگر کوئی "ہوس" تھی تو یہ کہ (زیادہ سے زیادہ حد تک) پاک زندگی بسر

خدیجہؓ تھا۔ یہ خاتون بیوہ تھیں اور تجارت کرتی تھیں۔ حضور اقدس ﷺ ان کا سامان تجارت لے کر دو بار شام تشریف لے گئے اور اپنے فرائض کو جو آپ ﷺ کے سپرد کئے گئے تھے نہایت دیانت، ذمہ داری اور مستعدی سے ادا کیا اور حضرت خدیجہؓ سے خراج تحسین وصول کیا۔ عرب مورخوں نے آنحضرت ﷺ کی شادی کے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں (یہ مورخین کہتے ہیں کہ) آپ ﷺ کی عمر پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ چالیس سال کی ہو چکی تھیں مگر اس کے باوجود ان کے چہرے پر حسن و جمال موجود تھا۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس محسن بیوی سے آپ ﷺ کے تعلقات نہایت خوشگوار اور انتہائی محبت آمیز تھے۔ ان کی زندگی کے آخری لمحے تک آپ انہیں سچے دل سے چاہتے رہے اور کسی دوسری خاتون کو اپنی توجہ اور محبت کا مرکز نہیں بنایا۔

رُوحِ پاک

یہاں کارلائل رسول اقدس ﷺ کے دعویٰ نبوت کی صداقت پر ایک عجیب دردمندانہ دلیل پیش کرتا ہے جو ہر منصف مزاج انسان کے دل میں گھر کرلیتی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

حیات قدسی کا لطیف پہلو

(کیا یہ عجیب بات نہیں کہ) حضرت محمد ﷺ نے اپنے جوش شباب کا زمانہ تو نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ گذار دیا (اس دور میں جب انسان کی آرزوئیں جوان ہوتی ہیں آپ ﷺ نے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوئی معمولی سی کوشش بھی نہیں کی) چالیس سال کی عمر تک آپ ﷺ نے اپنے بارے میں کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا نہ نبوت کا دعویٰ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی نیت میں کسی قسم کا مکرو فریب نہ تھا (کیونکہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہوتا تو نوجوانی کے آغاز ہی سے اس کے لئے پلاننگ کرتے اور خود کو لوگوں سے متعارف کرنے کی غرض سے گراؤنڈ تیار کرتے) حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کی عام عادت کے برعکس جو اہم اور بڑے واقعات رونما ہوئے وہ سب حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ظاہر ہوئے جب آپ ﷺ کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی، اس وقت تک آپ ﷺ میں اگر کوئی "ہوس" تھی تو یہ کہ (زیادہ سے زیادہ حد تک) پاک زندگی بسر

کی جائے، اس وقت تک تو آپ ﷺ بہت اچھی شہرت کے مالک تھے اور آپ ﷺ کے ہمسائے آپ کے بارے میں نیک گمان رکھتے تھے (کیا یہ عجیب بات نہیں کہ) جب آپ ﷺ بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو گئے، جوش شباب ختم ہو گیا) اور جس دور میں انسان سکون و عافیت کی زندگی گذارنا چاہتا ہے تو (بعض مسیحی مصنّفین کے خیال کے مطابق) اس وقت آپ ﷺ کو ہوس پرستی کی سوجھی اور اپنے ان تمام اعلیٰ خصائل و فضائل پر خود ہی پانی پھیر دیا جن سے آپ ﷺ کی گذشتہ زندگی آراستہ و مزین تھی، اس طرح آپ ﷺ نے ایک ایسی چیز کے حصول کی خاطر (نعوذ باللہ) مکرو فریب کا راستہ اختیار کیا جس سے آپؐ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ کم از کم میں تو ایسی دور از قیاس باتوں کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا۔

پاک طینت وجود

نہیں، ہرگز نہیں، مادر صحرا کی آغوش میں تربیت یافتہ اس سیاہ چشم، پاک طینت اور پاک باطن انسانی وجود میں حرص و ہوس اور شہرت طلبی کا جذبہ ہرگز کارفرما نہیں تھا بلکہ کچھ اور ہی خیالات تھے جن سے اس ﷺ کا دل سرشار تھا۔ یہ ایسی بزرگ و برتر جانِ پاک تھی جس سے خلوص و صداقت کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا (گویا یہ جان پاک خلوص و صداقت کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتی تھی) جس کی فطرت کا خمیر ہی اخلاص سے تیار ہوا تھا۔ جس وقت (اس ﷺ کے معاشرے کے) دوسرے لوگ اوہام پرستی کا شکار ہو رہے تھے اور اس پر اڑے رہنے کے لئے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے رہے تھے یہ (واحد) ہستیٔ تھی جس کی عقل، وہم و گمان کے کسی پردے کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اس کی روح اور حقائق اشیا سے اس کی ﷺ ہی نے اسے اپنے معاشرے میں سب سے الگ اور ممتاز کر دیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ زندگی کی اصل حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ اس

ﷺ کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ کسی قسم کے اوہام باطلہ اس ﷺ کے ذہن و فکر پر اثرانداز نہ ہو سکے۔ یہ صفت جس کے لئے ہم نے "خلوص" کا لفظ استعمال کیا ہے دراصل صفات الٰہی کا ایک پرتو ہے اور جس شخص پر یہ پرتو پڑ جاتا ہے اس کی آواز دراصل صدائے غیب بن جاتی ہے جسے لوگ نہایت توجہ سے سنتے ہیں اور انہیں توجہ ہی سے یہ آواز سننا چاہئے کیونکہ اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی حقیر ہے۔

حقیقت کی تلاش

اس (پاک وجود) کے دل میں مدت دراز سے یہ خیالات پرورش پا رہے تھے جو سفر اور قیام میں اس کے قلب میں موجزن رہتے تھے کہ میں کیا ہوں؟ (کون ہوں) اور اس لامحدود کائنات کی حقیقت کیا ہے میں جس میں رہتا ہوں؟ موت کیا چیز ہے؟ زندگی کیا ہے؟ اور میرا ایقان کیا ہونا چاہئے اور دائرہ عمل کیا ہونا چاہئے؟ یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب نہ کوہ حرا کی ہیبت ناک چٹانیں دے سکتی تھیں اور نہ کوہ سینا کی پُرہول چٹانوں کے پاس ان کا جواب تھا۔ ریت اڑاتے ہوئے بیاباں اور رات کو آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے بھی ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ ہاں! اگر ان سوالات کا کوئی جواب دے سکا تو وہ اس انسان (آنحضرت ﷺ) کی روح پاک تھی یا وہ الہام ربانی جو اس ﷺ کے قلب پر جلوہ گر ہوتا تھا۔ آخر آپ ﷺ کی پاک روح پر نازل ہونے والے الہام ربانی ہی نے آپ ﷺ کے ان سوالات کا جواب دے کر ان لاینحل مسائل کو پورے طور پر حل کر دیا۔

(اس میں کیا شک ہے کہ) یہ وہ مسائل ہیں جن کے بارے میں ہم میں سے ہر شخص کو اپنے دل سے سوال کرنا چاہئے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان سوالات کا حل تلاش کریں، ان کے جوابات معلوم کریں۔ یہ پیغمبرؐ امی ان سوالات کو اس قدر اہم

خیال کرتا تھا کہ ان کے مقابلے میں اس کے نزدیک دنیا کی ساری چیزیں بے حقیقت تھیں۔ اس ﷺ کے خیال میں نہ تو یونانیوں کے پیچ در پیچ مذہبی مباحث سے ان سوالات کا جواب مل سکتا تھا، نہ یہودیوں کی قدیم مبہم روایات ان سوالات کا جواب دے سکتی تھیں، نہ عربوں کی خلاف عقل بت پرستی ان مسائل کو حل کر سکتی تھی۔

دو میں سے ------ ایک راستہ

کسی مردِ عظیم (ہیرو) کی سب سے پہلی اور اہم ترین خصوصیت جسے اس کی تمام خصوصیات کا حاصل اور جوہر کہنا چاہئے یہ ہوتی ہے کہ وہ اشیا کی ظاہری صورت سے ان کی باطنی حقیقت کو پالیتا ہے۔ رسوم و رواج جو معاشرے میں معتبر بن جاتے ہیں اور روایات جو قبولیت عام حاصل کر لیتی ہیں وہ اچھی بھی ہو سکتی ہیں اور بری بھی لیکن ان تمام رسوم و روایات کو اس حقیقت کا مظہر ہونا چاہئے جس کا مظہر نہ ہونے کی صورت میں ان کی حیثیت بت پرستی سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر اگر سیاہ لکڑی کا ایک ٹکڑا خدائی کا دعویٰ کرنے لگے تو حقیقت کی تلاش میں سرگرم رہنے والی طبیعت کے مالک شخص کے لئے ایسا دعویٰ مضحکہ خیز اور قابل نفرت بن جائے گا۔ سونے کے تاروں سے منقش کئے ہوئے وہ بت جن کی سرداران قریش پرستش کرتے تھے حضرت محمد ﷺ کے لئے کیا حیثیت رکھتے تھے خواہ ساری دنیا ان کی پرستش کرتی وہ آپ ﷺ کے کس کام کے تھے؟ کیونکہ آپ ﷺ کے سامنے تو حقیقت کبریٰ اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ اس طرح روشن ہو گئی تھی جیسے دن چڑھ جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے لئے دو ہی راستے تھے یا تو آپ ﷺ اس حقیقت کبریٰ کو قبول کر لیتے یا خود کو فنا کر ڈالتے۔ یعنی موت ہی آپ ﷺ کو اس کے قبول کرنے سے روک سکتی تھی۔ اس حقیقت کبریٰ کو قبول کرنے یا رد کر دینے کا بس یہی وقت تھا اس کے بعد ابد تک پھر اس کا موقع نہیں آ سکتا تھا (اور آپ ﷺ نے اس حقیقت کبریٰ یعنی ذات واحد و یگانہ ہستی کو شناخت کر کے اور اس پر ایمان لا کر بنی نوع انسان کو قیامت تک کے لئے گمراہی سے بچالیا)۔

خلاف عقل الزام

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے (مقدس) مشن کے پیچھے ہوا و ہوس تھی یعنی آپ ﷺ نے حب جاہ کی خاطر یہ سارے کام کئے تو غور کرنا چاہئے کہ وہ کون سی چیزیں تھیں جو آپ ﷺ کے لئے سکون قلب اور اطمینان کا باعث ہو سکتی تھیں؟ کیا روم کے بادشاہ ہرقل کا تاج شاہی؟ یا ایران کے بادشاہ خسرو کا تخت و تاج؟ ایسے شخص کے لئے تو ساری دنیا کے تاج و تخت بھی کسی کام کے نہ تھے جس کے پیش نظر یہ دنیا اور اس کی دلچسپیاں تھیں ہی نہیں۔ اس کے سامنے تو کچھ اور ہی معاملات تھے اور وہ تھے معاملات آخرت۔ دنیا کے سارے تاج و تخت اگر حاصل بھی ہو جائیں تو کب تک؟ ان کی عمر کتنی ہے؟ کیا سردار مکہ بن کر یا بادشاہ عرب کا مقام حاصل کر کے اور عصائے شاہی ہاتھ میں لے کر نجات اخروی حاصل ہو سکتی ہے؟ میں پوری طرح یقین رکھتا ہوں کہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس حضرت محمد ﷺ کے بارے میں اس قسم کے خیالات کو خلاف عقل قرار دے کر دل سے نکال پھینکنا چاہئے (کہ آپ ﷺ کے (مقدس) مشن کے پیچھے جاہ طلبی اور مکر و فریب کام کر رہا تھا۔ نعوذ باللہ)

نزولِ وحی

حضرت محمد ﷺ کا معمول تھا کہ رمضان کے مہینے میں آبادی سے دور (اور دنیا کی دلچسپیوں سے قطع تعلق کر کے) گوشہ ء تنہائی میں جا بیٹھتے تھے۔ اس زمانے کے عربوں کا یہ دستور عام بھی تھا جو ہر اعتبار سے تعریف و ستائش کا مستحق ہے، خاص طور سے حضور اقدس ﷺ جیسی ہستی کے لئے تو یہ خلوت نشینی آپ ﷺ کی فطرت کے عین مطابق اور حد درجہ مفید تھی۔ کیونکہ پہاڑوں کی سکوت آگیں فضا میں بیٹھ کر خاموشی سے فکر و تدبر کرنے اور اپنے نفس سے خطاب کرنے کا طریقہ نہایت مفید نتائج کا حامل ہوتا ہے۔

غار حرا میں خلوت نشینی

آپ ﷺ کی عمر کا چالیسواں سال تھا اور مہینہ وہی رمضان کا، جب آپ ﷺ غور و فکر کرنے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے کی غرض سے مکہ کے باہر حرا نامی پہاڑ کے ایک غار میں خلوت گزیں تھے کہ ایک روز آپ ﷺ نے اپنی رفیقہ حیات حضرت خدیجہؓ کو جو ان دنوں اپنے سامان خانہ داری کے ساتھ اس غار کے قریب ہی مقیم تھیں یہ خوشخبری سنائی کہ -----!

"اللہ تعالیٰ کے فضل سے جس کا بیان ممکن ہی نہیں ہے مجھ پر سارے حقائق کھل گئے ہیں، سارے عقدے حل ہو گئے ہیں (اور حقیقت کی تلاش کی راہ میں جو

شکوک و شبہات پیدا ہوا کرتے ہیں) میرا دل اور دماغ ان سے پاک ہیں۔ حقائق و معارف میرے سامنے بے نقاب ہو گئے ہیں۔ یہ سارے بت اور ان سے متعلق عقائد و نظریات لغو و بے معنی ہیں۔ یہ تو محض لکڑیوں کے ٹکڑے ہیں، اس ساری کائنات کا مالک صرف خدا ہے جو اکیلا ہے، ان سارے بتوں اور اوہام پرستیوں کو چھوڑ کر ہمیں خدائے واحد کی طرف رجوع کرنا اور صرف اسی کے آگے سر جھکانا چاہئے کیونکہ وہی ایک ذات ہے جو سب سے برتر اور بزرگ تر ہے، اس کے سوائے کوئی نہیں جو عظمت و رفعت میں اس کا شریک و ثانی ہو یہ صرف اسی کے شایان شاں ہے۔ وہی حقیقت ہے باقی سب مجاز (اور یہ بت غیر حقیقی معبود ہیں) اسی (معبود حقیقی) نے ہمیں پیدا کیا ہے وہی ہماری پرورش کر رہا ہے، ہم سب اسی کا عکس ہیں، اس حسن ازل کی نقاب ہیں جس میں سے اس کا جمال عکس ریز ہو رہا ہے۔ **"اللہ اکبر"** (اللہ سب سے بڑا اور عظیم تر ہے) اسلام نام ہے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینے کا یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا پر سر تسلیم خم کر دینے کا۔ (اسلام کی رو سے) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کامل ہی سے ہمیں ساری قوتیں مل سکتی ہیں۔ اسے اختیار ہے کہ وہ ہماری دنیا اور دنیا کے بعد کی زندگی کے لئے جو چاہے کرے، جو چاہے ہمیں دے خواہ وہ موت ہو یا موت سے بھی خراب تر اور بری چیز کیوں نہ ہو۔ غرض وہ جو کچھ ہمیں دے گا وہی ہمارے حق میں سب سے مفید اور بہتر ہو گا (کیونکہ وہ ہمارا خالق و مالک اور پرورش کنندہ ہے) پس ہم خود کو اس کے سپرد کرتے ہیں۔"

(عظیم جرمن مفکر اور شاعر) "گوئٹے" (حضور اقدس ﷺ کے ان ارشادات سے آگاہی حاصل کر کے) کہتا ہے:

"IF THIS BE ISLAM, DO WE NOT ALL LIVE IN ISLAM?" (P-291)

(یعنی اگر یہی اسلام ہے تو کیا ہم سب اسلام پر کاربند نہیں ہیں؟ کیا ہم سب مسلمان نہیں ہیں؟)

ہاں ہاں! ہم میں سے جو لوگ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مطابق زندگی گزارتے ہیں بلاشبہ وہ سب مسلمان ہیں۔

اسلام کی روح

عقل انسانی کی انتہائے کمال یہ نہیں کہ انسان تقدیر کے سامنے سپرانداز ہو جائے کیونکہ قدرت کا قانون تو اسے مطیع کر کے رہے گا۔ ہاں عقل انسانی کی انتہائے کمال یہ ہے کہ انسان کو اس امر کا علم اور یقین ہونا چاہئے کہ تقدیر الٰہی نے ہمارے لئے جو کچھ تجویز کیا ہے وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھے کہ اس کی عقل نارسا اس عجیب تر اور محیرالعقول نظام کائنات کی باریکیوں کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتی اس لئے اسے اس میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اس حقیقت کا بھی ادراک ہونا چاہئے کہ اگرچہ اس کی عقل اس کارخانۂ قدرت کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ نظام عالم ایک منصفانہ قانون قدرت کے تحت کام کر رہا ہے جس کی غرض و غایت سراسر خیر ہے' انسان کا فرض ہے کہ وہ اس قانون کا تابع رہے اور بے چون و چرا اس کا ساتھ دے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں دنیا کی معلوم صداقتوں میں سے اس سے بہتر اور کوئی صداقت نہیں (جس پر بطور ضابطۂ اخلاق عمل کیا جائے) جیسے ہی انسان سطح بینی اور عارضی سود و زیاں کے اندیشوں سے قطع نظر کر کے اس ابدی قانون قدرت کی پیروی کرتا ہے جو ساری کائنات پر محیط ہے تو صداقت کو پالیتا ہے اور فتح و کامرانی کی شاہراہ کو جالیتا ہے۔ گویا اس کی کامیابی و کامرانی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اس عظیم تر قانون قدرت کا ساتھ دے۔ اس قانون کی پیروی اور اس کی پوری طرح پابندی کے لئے سب سے پہلی شرط اس امر کا یقین کامل ہے کہ فی الحقیقت ایسا قانون قدرت موجود بھی ہے اور اس کی بنیاد سراسر خیر و فلاح پر ہے ---- یہی اسلام کی اصل روح ہے اور عیسائیت کا حاصل بھی تو یہی ہے' کیونکہ اسلام عیسائیت ہی کی ایک .... شکل ہے (۱) اور اگر عیسائیت نہ ہوتی تو اسلام بھی نہ ہوتا۔

راضی برضا

مذہب عیسوی میں بھی سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا گیا ہے کہ انسان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا چاہئے۔ مسیحی تعلیم کہتی ہے کہ ہمیں نفس کی پیروی کرنے' بے معنی اعتراضات پر توجہ دینے اور ایسی خواہشات یا مصائب کو مرکز توجہ بنانے سے گریز کرنا چاہئے جن کا کچھ حاصل نہیں۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہمارا علم کچھ نہیں ہم کچھ نہیں جانتے' جو چیز ہمیں خراب اور ظالمانہ نظر آتی ہے ممکن ہے وہ ایسی نہ ہو۔ جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت سمجھتے ہوئے قبول کر لینا چاہئے اور یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ دانا و بینا ہے وہ اپنی مصلحتوں کو بہت بہتر سمجھتا ہے' اس نے میرے لئے جو کچھ تجویز کیا ہے اس میں میرے لئے کوئی بہتری ہوگی۔ اگر وہ مجھے ذبح بھی کر دے تب بھی میں اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دوں گا۔

---

(۱) یہاں کارلائل محض مسیحی ہونے کی وجہ سے اسلام کو عیسائیت کی "بگڑی" ہوئی شکل قرار دیتا ہے۔ اس موضوع پر انشاء اللہ ہم اپنے تفصیلی تبصرے میں گفتگو کریں گے۔ (پیام)

(اسی طرح) اسلام (بھی) ایثار نفس سے عبارت ہے یعنی اپنی خواہشات اور ضروریات کو دوسروں کی ضرورت پر قربان کر دینا اور اپنے نفس کو مار دینا۔ یہ ہے عقل کا وہ نقطۂ کمال جس کا قدرت کی طرف سے اب تک دنیا پر انکشاف ہو سکا ہے۔ یہی وہ نور ہے جو اس امی رسول ﷺ کو عطا ہوا تھا تاکہ ظلمات کے وہ سارے پردے چاک ہو جائیں جو عالم روحانیت پر پڑے ہوئے تھے۔ انسانی زندگی کو ابدیت بخشنے والا یہ نور جو حیات و ممات کے اس عالم تاریک میں جلوہ فگن ہوا اور (جسے) حضرت محمد ﷺ نے "وحی" اور "جبریل" کے الفاظ سے موسوم کیا۔ (اگر کوئی اس پر اعتراض کرتا ہے تو اسے بتانا چاہئے کہ) وحی کے اس مہر منور کو (جو حضور اقدس ﷺ پر ضو فگن ہوا) اور کس نام سے پکارا جائے؟ کیا اس کے لئے اس سے بہتر کوئی نام تجویز کیا جا سکتا ہے؟

عقل کیا ہے؟ ہمارے دل میں قدرت کی طرف سے جو نازک اور پاکیزہ خیالات القا کئے جاتے ہیں ان کے پرتو اور عکس کا نام ہی تو عقل ہے۔ حقائق کی تہہ تک پہنچنا اور اشیاء کی حقیقت و اصلیت معلوم کرنا ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق صرف وجدان سے ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ منطق بھی اس کی توضیح کرنے سے قاصر ہے۔ ممتاز جرمن شاعر اور ناول نگار "نوالس" (NOWALIS) کہتا ہے کہ کیا وجود باری تعالیٰ کا بہترین ثبوت ایمان بالغیب فراہم نہیں کرتا؟ حضرت محمد ﷺ کو جو روح پاک ودیعت کی گئی تھی وہ وجود باری تعالیٰ کی شہادت کاملہ اور اس کے بارے میں ایمان و ایقان سے معمور تھی۔ پس یہ ایک بالکل فطری امر تھا کہ آں جناب ﷺ اسی صداقت کبریٰ کو اس کائنات کی سب سے اہم اور قیمتی متاع سمجھتے (کہ اس کائنات لامحدود کا ایک خالق ہے جو مدبر بالا رادہ بھی ہے اور اپنے بندوں پر مہربان اور ان کا

نگراں بھی) اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہر قسم کی ظلمتوں سے محفوظ رکھا، ہر قسم کی ہلاکت سے بچایا تاکہ آپ ﷺ کو اس حقیقت کبریٰ سے سرفراز فرمایا جائے۔ پس آپ ﷺ کا یہ فرض ٹھہرا کہ یہ پیغام آپ ﷺ ساری دنیا تک پہنچائیں اور (اسلامی کلمہ) "محمد رسول اللہ" کے یہی معنی ہیں کہ (حضرت) محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں (یعنی آپ کو بھیجا گیا ہے تاکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغام اس کے بندوں تک پہنچائیں) اس اعتبار سے یہ بالکل درست ہے کہ آپ ﷺ اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

(ہم میں سے کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ) حضرت محمد ﷺ نے جب یہ پیغام اپنی محبوب اور خوش خصال بیوی حضرت خدیجہؓ کو سنایا ہو گا تو انہوں نے اسے کیسے تعجب اور حیرت کے ساتھ سنا ہو گا لیکن آخر کار انہوں نے اس پیغام کی تصدیق کی اور کہا کہ "آپ ﷺ نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے"۔

حضور اقدس ﷺ کی عظمت کا ایک ایمان افروز واقعہ

کیا ہم اس کیفیت کا اندازہ کر سکتے ہیں جو حضور اقدس ﷺ پر اس وقت طاری ہوئی ہو گی جب آپ ﷺ کی شریک حیات (حضرت خدیجہؓ) نے آپ ﷺ کا پیغام قبول کر لیا ہو گا؟ آپ ﷺ کو کس قدر مسرت حاصل ہوئی ہو گی اور آپ ﷺ ان کے کس قدر ممنون ہوئے ہوں گے (کوئی تصور کر سکتا ہے کہ) آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے احسانات میں اس تازہ احسان قبولیت کو کیا مقام دیا ہو گا؟ (جرمنی کا ممتاز شاعر اور ادیب) نوالس کہتا ہے کہ "جس وقت کوئی شخص میرے نظریے کو تسلیم کر لیتا ہے تو میرا یہ نظریہ میری نظر میں بہت زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے"۔ چنانچہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ عنایات اور مہربانیوں کے اگر درجات ہیں تو یہ ان کا انتہائی اور آخری درجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ (اپنی اس بیوی)

حضرت خدیجہؓ کو زندگی کے آخری لمحے تک فراموش نہ کر سکے چنانچہ اس واقعے پر مدت دراز گذر چکی تھی کہ ایک روز آپ ﷺ کی سب سے کمسن اور نہایت محبوب بیوی حضرت عائشہؓ نے جو اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے عالم اسلام میں نہایت ممتاز مقام رکھتی ہیں آپ ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں خدیجہؓ سے اچھی نہیں ہوں وہ تو بیوہ بھی تھیں، بوڑھی اور بد صورت بھی ہو گئی تھیں؟ کیا ان کی نسبت آپ مجھ سے زیادہ محبت نہیں کرتے؟ حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا کہ "نہیں! خدا کی قسم ہرگز نہیں! تمہارے مقابلے میں خدیجہؓ مجھے بہت زیادہ عزیز ہیں، وہ اس وقت مجھ پر ایمان لائیں جب کوئی مجھے قبول کرنے کو آمادہ نہ تھا اور میرے دعویٰ پر یقین نہ کرتا تھا۔ اس وقت اس دنیا میں صرف ایک ہی میرا دوست تھا اور وہ تھیں خدیجہؓ۔

تبلیغ کا آغاز

حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت محمد ﷺ پر جو لوگ سب سے پہلے ایمان لائے وہ ہیں آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ بن ابی طالب اور آپ ﷺ کے (آزاد کردہ) غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ۔ جب آپ ﷺ نے اپنے حلقہ ء احباب اور شناساؤں کے سامنے اپنے (ان نئے) عقائد و نظریات کا اظہار فرمایا تو انہوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اور بعض نے آپ ﷺ کا مضحکہ اڑایا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں تین سال کی ابتدائی مدت میں آپؐ غالباً" صرف تیرہ افراد کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر سکے۔ آپ ﷺ کی رفتار تبلیغ بہت دھیمی تھی اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں میں بہت آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا۔ جن حالات میں اور جس انداز سے آپ ﷺ جدوجہد فرما رہے تھے اس میں شاید اس سے بہتر اور حوصلہ افزا نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور ایسے حالات میں اس قسم کی شخصیات کو اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

پہلی دعوت عام

تین سال کی اس معمولی سی کامیابی کے بعد آپ ﷺ نے اپنے رشتہ داروں میں سے چالیس اکابر کو ایک دعوت میں مدعو کیا (جسے تاریخ اسلام میں "دعوت ذوالعشیرہ" کہتے ہیں گویا یہ حضور اقدس ﷺ کی طرف سے پہلی دعوت عام تھی)

جب لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو آپ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے اپنے عقائد کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ پیغام میں دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچانے پر مامور ہوا ہوں۔ یہ دنیا کی سب سے قیمتی نعمت ہے جس سے بہتر کوئی نعمت نہیں، آپ لوگوں میں سے کون اس کام میں میرا ساتھ دے گا؟ اس تقریب میں شریک لوگ گہرے سکوت اور تذبذب کے ساتھ آپ ﷺ کی تقریر سنتے رہے اور کسی نے آپ ﷺ کی آواز پر لبیک نہ کہی سوائے سولہ سالہ (نوجوان) حضرت علیؓ کے جنہوں نے اس سکوت کو توڑا اور کھڑے ہو کر آپ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے بہت پرجوش لہجے میں اعلان کیا کہ "میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔

سولہ سالہ علیؓ

یہ اجتماع جس میں حضرت علیؓ کے والد جناب ابو طالب بھی شامل تھے اگرچہ حضرت محمد ﷺ کے مخالفین کا اجتماع نہ تھا (کیونکہ اس میں شریک تمام لوگ آپ ﷺ کے خاندان اور قبیلے بنو ہاشم کے اکابر تھے) مگر اس کے باوجود آپ ؐ کے ان رشتہ داروں میں سے سوائے حضرت علیؓ کے جو آپ ﷺ کے گھر میں رہتے تھے اور آپ ﷺ کے زیر سایہ پرورش پا رہے تھے اور کسی نے آپ ﷺ کو قبول نہ کیا) انہیں یہ بات بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوئی کہ ایک سن رسیدہ شخص جو کسی بھی علم سے آراستہ نہیں ایک سولہ سالہ لڑکے کو لے کر ساری دنیا کے خلاف مہم پر روانہ ہو رہا ہے ---- اور سارا مجمع قہقہے لگاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا (اور حضور اقدس ﷺ کے چچا سے بطور طنز کہا کہ لو ابو طالب! اب اپنے بھتیجے کی فرماں برداری کرو) مگر آگے چل کر واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ ہرگز قابل تمسخر بات نہ تھی بلکہ نہایت سنجیدہ اور اہم ترین معاملہ تھا۔ (حضور اقدس ﷺ پر ابتدا میں ایمان لانے والوں میں سے) حضرت علیؓ کی شخصیت پر تو بے اختیار پیار آتا ہے ان کی صفات ہی ایسی تھیں۔ کوئی موقع

ایسا نہ تھا جب انہوں نے خود کو ایک شریف النفس، محبت کرنے والا اور جری دل ثابت نہ کیا ہو، وہ غیر معمولی شجاع انسان تھے۔ اگرچہ وہ شیر کی طرح دلیر تھے مگر اس کے باوجود ان میں ایسی صداقت شعاری اور محبت کی ایسی شان نظر آتی ہے جو کمزوروں کی خاطر لڑنے والے کسی مسیحی سورما (KNIGHTHOOD) کے شایان شان ہو سکتی ہے۔ آپؓ انتہائی نیک نفس انسان تھے اس لئے دوسروں کو بھی اپنی ہی طرح نیک سمجھتے ہوئے ان پر اعتماد کر لیتے تھے۔ اسی زود اعتمادی نے آپؓ کی جان لے لی اور آپؓ بغداد (۱) کی جامع مسجد میں (اپنے ایک مذہبی مخالف عبدالرحمن بن ملجم خارجی کے ہاتھوں) شہید کر دیئے گئے۔ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرنے سے قبل آپؓ نے فرمایا کہ اس زخم کے نتیجے میں اگر میں جاں بر ہو گیا تو قاتل کو معاف کر دوں گا اور اگر وفات پا جاؤں تو اسی وقت اس کی گردن مار دینا تاکہ ہم دونوں بیک وقت منصف حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں اور وہ فیصلہ کر دے کہ ہم دونوں میں سے کون حق پر تھا۔

حضور اقدس ﷺ کی مخالفت

(اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں) آنحضرت ﷺ کی تبلیغ کا دائرہ جیسے جیسے وسیع ہوتا گیا قریش مکہ کی ناگواری میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ یہ قریش کعبہ کے نگراں اور بتوں کے متولی تھے۔ قریش کے ان اکابر میں سے ابھی تک دو ایک ذی اثر افراد ہی اسلام قبول کر سکے تھے (جیسے حضرت ابو بکرؓ و حضرت عثمانؓ) اور اسلام بہت آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن وسعت ضرور اختیار کر رہا تھا اس لئے اہل مکہ میں سے ہر شخص آنحضرت ﷺ کا مخالف ہوتا جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ یہ ہے

---

(۱) بغداد نہیں، کوفہ میں۔

کون جو خود ہم سب سے زیادہ عقلمند ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، ہمیں احمق سمجھتا ہے اور ہمارے بتوں کو محض لکڑی کے کھلونے قرار دیتا ہے (اس مخالفت عام سے مجبور ہو کر) آخر آپ ﷺ کے خوش خصال چچا ابو طالب کو ایک دن آپ ﷺ سے کہنا پڑا کہ (اے میرے بھتیجے!) کیا تم اپنی اس تبلیغ سے رک نہیں سکتے، بے شک تم خود ان عقائد پر قائم رہو لیکن دوسرے لوگوں میں ان کی تبلیغ کر کے انہیں پریشانی میں مبتلا نہ کرو، آخر قریش کے سرداروں سے بگاڑ پیدا کرنے کا کیا حاصل؟ اور ہم سب کو مصیبت میں ڈالنے کا کیا فائدہ؟ حضور اقدس ﷺ نے ابو طالب کی یہ تقریر سن کر (کیا جرات مندانہ، ایمان افروز اور یقینِ محکم سے پُر) جواب دیا، آپ ﷺ نے فرمایا -----"(اے میرے چچا!) اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں اور کہیں کہ تم اس تبلیغ سے باز آ جاؤ تو بھی میں اس فرض کی ادائیگی سے رک نہیں سکتا"۔

(حضور اقدس ﷺ نے سورج اور چاند کی مثال دے کر اپنے چچا کو جو جواب دیا تھا شاید اس میں یہ نکتہ پوشیدہ تھا کہ) صداقت کا جو پیغام لے کر آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے اس کے اندر ایک ایسا عنصر موجود تھا جس کی حیثیت، جس کی قدر اور جس کا مقام و مرتبہ آفتاب و ماہتاب سے کسی طور کم نہ تھا۔ یہ ایسا (طاقتور اور فطری) عنصر ہے کہ خواہ آفتاب و ماہتاب، دنیا کے سارے انسان اور سارے موجودات عالم بھی اس کی مخالفت کریں جب تک اللہ چاہے گا وہ اپنا کام کرتا رہے گا۔ اس پیغام صداقت کا لانے والا یہ پیغام کسی جذبۂ خود اختیاری کے تحت نہیں پہنچا رہا تھا بلکہ یہ اس پیغام اور پیغامبر کی فطرت کا خاصہ اور لازمہ تھا جس کے بغیر وہ رہ سکتا ہی نہیں تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اپنے چچا (ابو طالب) کو یہ جواب دے کر حضور اقدس ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کیونکہ آپ ﷺ کا خیال تھا کہ ابو طالب آپ ﷺ

سے بہت محبت کرتے ہیں (اور وہ کسی صورت میں آپ کی امداد و اعانت سے دست کش نہیں ہوں گے) ادھر جو فرض آپ ﷺ کے سپرد کیا گیا تھا وہ بہت دشوار اور مشکل تھا۔ (۲)

ہجرت حبشہ کا حکم

(اس کے باوجود) آپ ﷺ کا معمول ہو گیا کہ جو شخص آپ ﷺ سے ملتا آپ ﷺ اس سے اپنے اس پیغام صداقت پر گفتگو فرماتے۔ حج کے موقع پر جو زائرین مکہ آتے ان کے سامنے بھی آپ ﷺ اپنے عقائد کی صداقت پر اظہار خیال فرماتے۔ اس طرح اگرچہ آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ قریش مکہ میں آپ ﷺ کی مخالفت مزید شدت اختیار کرنے لگی۔ آپ ﷺ کے خلاف نفرت بڑھنے لگی اور خطرات میں اضافہ ہونے لگا۔ اگرچہ آپ ﷺ کے صاحب اثر و اقتدار عزیزوں اور رشتہ داروں نے ابتدا میں آپ ﷺ کی حمایت کی مگر پھر ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ خود آپ ﷺ ہی کی تحریک و ہدایت پر ان تمام لوگوں کو جو آپ ﷺ پر ایمان لا چکے تھے رفتہ رفتہ مکہ چھوڑ کر سمندر پار واقع ملک حبشہ میں پناہ لینی پڑی۔

حضور اقدس ﷺ کو شہید کرنے کا منصوبہ

اب قریش کے اشتعال میں اور اضافہ ہو گیا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس

---

(۲) شاید کارلائل کی اس حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکی کہ حضور ﷺ اقدس کا یہ جواب سن کر جناب ابو طالب بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے کہا اے میرے بھتیجے جاؤ اور اپنا پیغام لوگوں کو پہنچاؤ جہاں تک میرے بس میں ہے میں تمہاری حمایت کروں گا۔ (پیام)

قصے ہی کو ختم کر دیا جائے چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس عہد کو پختہ کرنے کے لئے حلف اٹھایا کہ وہ آپ ﷺ کو ضرور قتل کریں گے۔ یہ وہ وقت تھا کہ آپ ﷺ کی (سچی رفیق اور ہمدرد) خوش خصال بیوی حضرت خدیجہؓ اور آپ ﷺ کے (ذی اثر چچا) ابو طالب کا انتقال ہو چکا تھا (جن سے اس نازک دور میں حمایت کی کچھ امید ہو سکتی تھی) اگرچہ (حضرت) محمد ﷺ کو ہماری کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان دنوں آپ ﷺ سخت تکلیف دہ حالات سے گذر رہے تھے، کبھی آپ ﷺ کو غاروں میں روپوش ہونا پڑا، کبھی بھیس بدل کر وقت گذارنا پڑا، (۳) کبھی گھر سے بے گھر ہونا پڑا، ہر وقت آپ ﷺ کی زندگی خطرے میں رہتی تھی۔ کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ کی جان کے لالے پڑ گئے اور بعض دفعہ آپ قتل ہونے سے بس بال بال بچے، کبھی ایسا ہوا کہ آپ ﷺ کا تعاقب کرنے والے دشمن کا گھوڑا بدک گیا، اسی طرح کے کسی اور واقعے نے آپ ﷺ کو موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا اگر ایسے واقعات پیش نہ آتے تو بلاشبہ آپ ﷺ کا پیغام ریگ زار عرب میں ہی دفن ہو جاتا اور دنیا کو اس (سرمدی پیغام) کا علم ہی نہ ہوتا مگر مالک قضا و قدر کو منظور نہ تھا کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کا پیغام اس طرح بے نام و نشان رہ جائے (چنانچہ قدرت نے اس پیغام کی ابدی بقا اور اس کے عالم گیر ہونے کے سامان پیدا کر دیئے جس کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔)

---

(۳) حضورؐ اقدس کی تاریخِ حیات میں بھیس بدل کر زندگی گزارنے کا کوئی ایک واقعہ نہیں ملتا۔ (پیام)

ہجرت

حضرت محمد ﷺ کے دعویٰ نبوت کا تیرھواں سال طلوع ہو چکا تھا کہ آپ ﷺ کے دشمنوں نے آپ ﷺ کے قتل پر اتفاق کر لیا۔ ایک منصوبہ تیار کیا گیا جس کے مطابق ہر قبیلے سے ایک ایک جواں مرد چنا گیا اس طرح چالیس ”جاں بازوں“ کا ایک گروہ تیار ہو گیا جس نے باہم عہد کیا کہ آپ ﷺ کو قتل کر کے رہیں گے۔ اب ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ آپ ﷺ کا مکہ میں رہنا ممکن نہ رہا تھا چنانچہ آپ نے یثرب نامی بستی کی طرف رخت سفر باندھا جہاں کے بہت سے لوگ اسلام قبول کر چکے تھے۔ یہ مقام جو بعد میں آپ ﷺ کے قیام کی وجہ سے ”مدینتہ النبی“ کے نام سے معلوم و مشہور ہو گیا، مکہ سے دو سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان (کوئی سرسبز و شاداب وادی، کوئی نخلستان، کوئی آرام دہ مقام نہیں بلکہ شروع سے آخر تک) حد نگاہ تک پھیلے ہوئے کوہ و بیاباں ہی پائے جاتے ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ اس خطرناک ترین اور جان جوکھوں کے سفر میں (جبکہ دشمن آپ ﷺ کے تعاقب میں تھا) آپ ﷺ پر کیا کچھ نہ بیت گئی ہو گی۔

مدینہ میں پرتپاک استقبال

غرض تمام دشواریوں سے گذرتے اور ان پر قابو پاتے ہوئے آپ ﷺ (اپنے مخلص ترین دوست اور جان نثار حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں) یثرب (مدینہ) پہنچے جہاں آپ ﷺ کا نہایت پرتپاک استقبال کیا گیا۔ اسلام کی تاریخ میں یہی واقعہ یعنی ہجرت نبوی اسلامی سنہ کے آغاز کا باعث ثابت ہوا۔ مسلمانوں کا ہجری سنہ جب حضرت محمد ﷺ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی ہمارے سنہ (یعنی عیسوی سنہ) ۶۲۲ سے مطابقت رکھتا ہے۔ (مہینہ جولائی کا تھا اور تاریخ ۲۰ تھی) (۱)

جب آپ ﷺ نے مدینہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو آپ ﷺ سن رسیدہ ہو چکے تھے اور آپ ﷺ کی عمر ۵۳ سال کی ہو گئی تھی۔ آپ ﷺ کے قدیمی ساتھی ایک ایک کر کے دنیا کو چھوڑ رہے تھے۔ آپ ﷺ ایک ویران اور خطرات سے پر راستے پر گامزن تھے، ہر طرف تاریکی تھی، مایوسی کی اس تاریکی میں اگر کوئی روشنی تھی تو وہ آپ ﷺ کا دل تھا جو نور امید سے روشن تھا (اس نور یقین کے بغیر کوئی شخص ایسی تاریک ترین اور پر خطر وادی میں قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا)۔

اس وقت تک کہ آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی آپ ﷺ کی ساری جدوجہد نہایت پرامن تھی اور آپ ﷺ نے وعظ و تلقین ہی کو ذریعہ تبلیغ بنایا مگر جب آپ ﷺ کے ظالم ابنائے وطن نے آپ ﷺ کو بڑی بے رحمی سے وطن سے نکال دیا، نہ صرف آپ ﷺ کے پیغام ربانی کو سننے سے انکار کر دیا بلکہ آپ ﷺ کے خون کے پیاسے ہو گئے تو مادر صحرا کا یہ فرزند عظیم بھی جوش میں آ گیا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ اپنی مدافعت کرے گا اور اس طرح مدافعت کرے گا جس طرح ایک باحمیت

---

(۱) مہینے اور تاریخ کا تعین "سرور انبیاء" مترجم پروفیسر مہدی حسین ناصری کے فٹ نوٹ سے ماخوذ۔ (پیام)

انسان اور ایک غیرت دار عرب کرتا ہے (گویا وہ کہہ رہا ہو) کہ اگر قریش یہی چاہتے ہیں تو چلو پھر یہی سہی (۲)۔ اگر یہ اس پیغام ربانی کو سننے سے گریزاں ہیں جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ ساری بنی نوع انسان کے لئے خیر و فلاح کا پیغام ہے اور اس پیغام کو جبر و ظلم اور تلوار کے ذریعے دبانا چاہتے ہیں تو یہ اپنا شوق تیغ زنی بھی پورا کر لیں (اب ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں)۔

حضور اقدس ﷺ کی جنگیں دفاعی تھیں

واقعہ ہجرت کے بعد آپ ﷺ دس سال زندہ رہے۔ آپ ﷺ کی یہ دس سالہ زندگی اپنے مشن کے لئے جدوجہد کرتے گذری اور آپ ﷺ کو بہت سی جنگیں لڑنی پڑیں۔ ان جنگوں اور کشمکش کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ یہ الزام کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا بار بار دہرایا گیا ہے۔ اگرچہ مذہب عیسوی کے پیرو بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ان کا مذہب تلوار کی بجائے محبت اور آشتی کے ذریعے پھیلا اور اس کی اشاعت میں صرف وعظ و تلقین کو دخل تھا لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت کا معیار یہی قرار دیدیں کہ وہ امن و آشتی اور وعظ و تلقین کے ذریعے پھیلا تو یہ ہماری بنیادی غلطی ہو گی۔ بلاشبہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا بھی دخل تھا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ تلوار کن حالات میں استعمال ہوئی اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ (یاد رکھنا چاہئے عام قاعدہ ہے کہ) دنیا کو جب بھی کوئی نیا خیال، کوئی نیا نظریہ، کوئی نیا عقیدہ ملتا ہے تو وہ ہمیشہ اول اول ایک ہی شخص کے ذہن میں پیدا ہوتا اور اسی میں قائم رہتا ہے۔ یہی ایک شخص ہوتا ہے جو سارے بنی نوع

---

(۲) یہ کارلائل کا ذاتی خیال ہے اور محض زور قلم۔ مادر صحرا کا یہ عظیم فرزند بطور خود ہرگز جوش میں نہیں آیا۔ یہ اس کا نہیں خدا کا فیصلہ تھا۔ انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔ (پیام)

مدینہ میں پرتپاک استقبال

غرض تمام دشواریوں سے گذرتے اور ان پر قابو پاتے ہوئے آپ ﷺ (اپنے مخلص ترین دوست اور جان نثار حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں) یثرب (مدینہ) پہنچے جہاں آپ ﷺ کا نہایت پرتپاک استقبال کیا گیا۔ اسلام کی تاریخ میں یہی واقعہ یعنی ہجرت نبوی اسلامی سنہ کے آغاز کا باعث ثابت ہوا۔ مسلمانوں کا ہجری سنہ جب حضرت محمد ﷺ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی ہمارے سنہ (یعنی عیسوی سنہ) ۶۲۲ سے مطابقت رکھتا ہے۔ (مہینہ جولائی کا تھا اور تاریخ ۲۰ تھی) (۱)

جب آپ ﷺ نے مدینہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو آپ ﷺ سن رسیدہ ہو چکے تھے اور آپ ﷺ کی عمر ۵۳ سال کی ہو گئی تھی۔ آپ ﷺ کے قدیمی ساتھی ایک ایک کر کے دنیا کو چھوڑ رہے تھے۔ آپ ﷺ ایک ویران اور خطرات سے پر راستے پر گامزن تھے، ہر طرف تاریکی تھی، مایوسی کی اس تاریکی میں اگر کوئی روشنی تھی تو وہ آپ ﷺ کا دل تھا جو نور امید سے روشن تھا (اس نور یقین کے بغیر کوئی شخص ایسی تاریک ترین اور پر خطر وادی میں قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا)۔

اس وقت تک کہ آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی آپ ﷺ کی ساری جدوجہد نہایت پرامن تھی اور آپ ﷺ نے وعظ و تلقین ہی کو ذریعہ تبلیغ بنایا مگر جب آپ ﷺ کے ظالم ابنائے وطن نے آپ ﷺ کو بڑی بے رحمی سے وطن سے نکال دیا، نہ صرف آپ ﷺ کے پیغام ربانی کو سننے سے انکار کر دیا بلکہ آپ ﷺ کے خون کے پیاسے ہو گئے تو مادر صحرا کا یہ فرزند عظیم بھی جوش میں آ گیا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ اپنی مدافعت کرے گا اور اس طرح مدافعت کرے گا جس طرح ایک باحمیت

---

(۱) مہینے اور تاریخ کا تعین "سرور انبیاء" مترجم پروفیسر مہدی حسین ناصری کے فٹ نوٹ سے ماخوذ۔ (پیام)

انسان اور ایک غیرت دار عرب کرتا ہے (گویا وہ کہہ رہا ہو) کہ اگر قریش یہی چاہتے ہیں تو چلو پھر یہی سہی (۲)۔ اگر یہ اس پیغام ربانی کو سننے سے گریزاں ہیں جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ ساری بنی نوع انسان کے لئے خیر و فلاح کا پیغام ہے اور اس پیغام کو جبر و ظلم اور تلوار کے ذریعے دبانا چاہتے ہیں تو یہ اپنا شوق تیغ زنی بھی پورا کر لیں (اب ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں)۔

حضور اقدس ﷺ کی جنگیں دفاعی تھیں

واقعہ ہجرت کے بعد آپ ﷺ دس سال زندہ رہے۔ آپ ﷺ کی یہ دس سالہ زندگی اپنے مشن کے لئے جدوجہد کرتے گذری اور آپ ﷺ کو بہت سی جنگیں لڑنی پڑیں۔ ان جنگوں اور کشمکش کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ یہ الزام کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا بار بار دہرایا گیا ہے۔ اگرچہ مذہب عیسوی کے پیرو بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ان کا مذہب تلوار کی بجائے محبت اور آشتی کے ذریعے پھیلا اور اس کی اشاعت میں صرف وعظ و تلقین کو دخل تھا لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت کا معیار یہی قرار دیدیں کہ وہ امن و آشتی اور وعظ و تلقین کے ذریعے پھیلا تو یہ ہماری بنیادی غلطی ہو گی۔ بلاشبہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا بھی دخل تھا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ تلوار کن حالات میں استعمال ہوئی اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ (یاد رکھنا چاہئے عام قاعدہ ہے کہ) دنیا کو جب بھی کوئی نیا خیال، کوئی نیا نظریہ، کوئی نیا عقیدہ ملتا ہے تو وہ ہمیشہ اول اول ایک ہی شخص کے ذہن میں پیدا ہوتا اور اسی میں قائم رہتا ہے۔ یہی ایک شخص ہوتا ہے جو سارے بنی نوع

---

(۲) یہ کارلائل کا ذاتی خیال ہے اور محض زور قلم۔ مادر صحرا کا یہ عظیم فرزند بطور خود ہرگز جوش میں نہیں آیا۔ یہ اس کا نہیں خدا کا فیصلہ تھا۔ انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔ (پیام)

انسان کے مقابلے میں اس عقیدے کا تنہا داعی ہوتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے، اگر وہ تلوار پکڑ کر اس کی اشاعت کے لئے تنہا نکل کھڑا ہو تو وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، لازما" پہلے اسے شمشیر زن ساتھی فراہم کرنے ہوں گے پس ماننا پڑے گا کہ ہر نظریہ خود بخود اپنے لئے جگہ بنا تا جاتا اور پذیرائی حاصل کرتا جاتا ہے۔

مذہب عیسوی کی اشاعت میں بھی تلوار کا دخل ہے

(کارلائل کہتا ہے کہ) جہاں تک مذہب عیسوی کا تعلق ہے تو یہ بھی صد فی صد محض تلقین و تبلیغ سے نہیں پھیلا اور اس کا دامن بھی نسل انسانی کے خون کے داغوں سے پاک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ گویا جب اسے تلوار پر دسترس حاصل ہو گئی تو اس نے بھی مذہب کی اشاعت کے لئے انسانی خون بہانے سے گریز نہیں کیا چنانچہ (فرانس کے مسیحی بادشاہ) شارلمین نے "سیکسن" (SAXONS) قوم کو (جو انگلستان کے قدیم باشندوں پر مشتمل تھی) عیسائی بنانے کے لئے بیدریغ تلوار کا استعمال کیا (اور سال ہا سال ان کے خلاف جنگ جاری رکھ کر ان کے خون کے دریا بہا دیئے اور ان کی بستیوں کی بستیاں تاراج کر ڈالیں) پس میرے خیال میں یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں ہر شخص کو اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے جدوجہد کرنے کا حق پہنچتا ہے، یہ جدوجہد خواہ ازروئے وعظ و تلقین ہو یا بذریعہ شمشیر یا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ جو اس کے بس میں ہو۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے خواہ وہ وعظ و تلقین کرے، جنگ و پیکار کرے اور اپنی ساری توانائیاں صرف کر دے لیکن اس کی جدوجہد کا انجام ایک ہی ہو گا کہ وہ اس شے پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گی جو مغلوب ہونے کے لئے بنائی ہی نہیں گئی۔ وہ اپنے سے بہتر اور افضل پر کبھی غالب نہیں آ سکتی ہاں اپنے سے کمتر شے پر ضرور غلبہ حاصل کر لے گی۔ یہ قانون قدرت ہے جو ہمیشہ فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے اور اس کا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا، نتیجہ یہ کہ کامیابی اسی کو حاصل ہو گی جس کا عمل عین فطرت کے مطابق ہو گا اور وہی افضل ترین کہلائے گا۔

حضور اقدس ﷺ کی کامیابیاں قانون قدرت کے مطابق تھیں

حضرت محمد ﷺ کی (مقبولیت اور آپ ﷺ کی) کامیابیوں پر نظر ڈالتے وقت اس حقیقت کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ (آپ ﷺ کی یہ کامیابیاں قدرت کی طرف سے تھیں کیونکہ) قدرت سب سے بڑی اور سچی ثالث ہے جو بزرگ تر اور اپنے تحمل کے اعتبار سے لامحدود ہے (اور کسی جوہر کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دیتی) مثال کے طور پر آپ مٹھی بھر گندم کے دانے کسی زمین میں ڈال دیجئے ان کے ساتھ جو بھوسی اور فاضل تنکے وغیرہ ہوں گے، جو خاک دھول ہو گی اور زمین میں موجود جو خس و خاشاک ہو گا، زمین ان سب کو اپنے اندر جذب کر لے گی، چونکہ آپ نے گندم کے یہ دانے مہربان مادر گیتی کے سپرد کئے ہیں جو انصاف پسند بھی ہے اس لئے وہ اس خس و خاشاک اور خاک دھول کی وجہ سے جو گندم کے دانوں کے ساتھ زمین میں ڈالا گیا، ان دانوں کو کبھی ضائع نہیں کرے گی بلکہ اس خس و خاشاک کو بھی کام میں لا کر گندم کے دانوں کو سرسبز اور لہلہاتی ہوئی بالیوں کی صورت میں تبدیل کر کے اپنے سینے پر نمایاں کر دے گی۔ (یہ آپ کی محنت کا حاصل ہو گا)

دروغ گوئی کو کبھی پذیرائی نصیب نہیں ہوتی

یہی حال مادر فطرت کا زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ہے، وہ دروغ گوئی اور ریاکاری کو پذیرائی نہیں بخشتی کیونکہ وہ (یعنی فطرت خود) صدق ہے، راستی ہے، سچائی ہے اور اپنے صدق و راستی کے اظہار میں انصاف سے کام لیتی ہے۔ وہ اصلیت اور سچائی کی تلاش میں رہتی ہے، جو چیز خالص ہوتی ہے اسے تو اپنی حفاظت

میں لے لیتی ہے اور غیر خالص فنا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مادر فطرت نے اب تک جتنی چیزوں کو اپنی آغوش میں پالا ان سب پر اپنا دامن حفاظت ڈالا' ان سب میں صدق و راستی کی روح موجود تھی (یعنی مادر فطرت دجل و فریب اور غیر صادق چیزوں کو کبھی پروان نہیں چڑھاتی گویا حضرت محمد ﷺ کا فتح و ظفر اور پیہم کامیابیوں سے ہمکنار ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ صدق و راستی کا پیکر عظیم تھے ورنہ آپ ﷺ کا مذہب صفحہء ہستی سے نیست و نابود ہو جاتا جیسا کہ جھوٹے مدعیان نبوت کے ساتھ فطرت کا سلوک ہوا) (۳)

ہمارے دل حقیقت سے محروم ہو گئے

یہ قانون فطرت ہے بلکہ اسے تقاضائے فطرت کہنا چاہئے کہ وہ صداقت کی روح کو محفوظ رکھتی ہے' اس کے جوہر کو ضائع ہونے سے بچا لیتی ہے وہ ایک ایسی صدائے راستی ہوتی ہے جو قلب فطرت سے نکلتی ہے جسے ہم میں سے کچھ اچھا کہتے اور کچھ (اس لئے) برا ٹھہراتے ہیں (کہ ان کے زنگ آلود قلوب اسے قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں) مگر فطرت کے نزدیک "اچھا" اور "برا" کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ اس رخ سے نہیں دیکھتی کہ کس میں کتنی آلائش ہے بلکہ وہ ہم میں جوہر تلاش کرتی ہے کہ یہ ہے یا نہیں؟ وہ دیکھتی ہے کہ ہم میں گندم بھی ہے یا نری بھوسی ہے؟ جہاں تک اچھا ہونے کا سوال ہے تو بہت سے لوگ اچھے ہو سکتے ہیں۔ ہم سب بھی اچھے ہیں اور ہم میں سے بعض بہت اچھے بھی کہلا سکتے ہیں لیکن (افسوس کہ) ہم (یعنی مسیحی۔ مولف) صداقت سے محروم ہیں' ہم گندم نہیں محض بھوسا ہیں ہم میں اصلیت کا فقدان ہے' ہم تصنع اور نام و نمود پر مرتے ہیں' ہم کبھی قلب کائنات کی آواز نہیں بن سکے اور اس سے ہمیشہ محروم و ناآشنا رہے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ نہ تو ہم پورے طور پر نیک ہیں نہ پورے طور پر بد ہیں ہمارا اشمار کسی میں بھی نہیں' ہم کچھ بھی نہ ہو سکے ہمارا رشتہ فطرت سے ٹوٹ گیا۔

---

(۳) یہاں پہنچ کر کارلائل ایک لطیف فلسفیانہ بحث چھیڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اب تک صداقت جتنی بار بھی ظاہر ہوئی نامکمل قالب میں ظاہر ہوئی اس لئے وہ قالب تو فنا ہو گیا مگر اس کی روح یعنی خود صداقت موجود رہی بلکہ بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر ہوتی رہی اور کبھی فنا نہیں ہوئی۔ (پیام)

حضورِ اقدس کا دین

ہم نے حضرت محمد ﷺ کے مذہب کو عیسائیت کی ایک قسم قرار دیا ہے (لیکن) حقیقت یہ ہے کہ جس گرم جوشی اور والہانہ پن سے اسے قبول کیا گیا اسے دیکھتے ہوئے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے مذہب اسلام شام کے ان بدقسمت مسیحی مذاہب و مسالک سے کہیں بہتر و برتر ثابت ہوا جو ان مباحث میں الجھے ہوئے تھے کہ حضرت مسیحؑ کی حقیقت ذات اور خدا کی حقیقتِ ذات ایک ہی ہے یا دونوں الگ الگ ہیں؟ دوسرے الفاظ میں کیا باپ اور بیٹا یعنی خدا اور مسیح ایک ہی جوہر کا حصہ ہیں؟ ان مباحثات و تنازعات کے نتیجے میں ان (مسیحی) لوگوں کے دماغوں میں ایک لاحاصل شور و غوغا تو ضرور برپا ہو گیا اور انہیں دماغی عیاشی کا سامان تو مل گیا مگر دل حقیقت سے محروم اور مردہ رہے۔

پھر ایک وقت آیا جب اسلام کی حقانیت بھی (بعد کے لوگوں کے پیدا کردہ) اوہام باطلہ اور عقائد ناقصہ سے مخلوط ہو گئی، لیکن اس کے باوجود لوگ اسے قبول کر رہے ہیں اور یہ قبولیت اس کے صدق و راستی کی وجہ سے ہے ان غلط عقائد کی وجہ سے نہیں جو اس کی تعلیم میں راہ پا گئے۔ (کارلائل پھر کہتا ہے کہ اسلام مسیحیت کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے (ا) لیکن یہ کوئی جامد اور بے جان تصور نہیں ہے، اس کا

(ا) اس غلط خیال کی دلائل کے ساتھ تردید انشاء اللہ آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔ (پیام)

قلب حرکت و حرارت سے معمور ہے، اس کی حیثیت منطقی گورکھ دھندے کی نہیں (بلکہ وہ حقیقت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے) مادر صحرا کی آغوش کا پروردہ یہ فرزند امی (حضرت محمد ﷺ) جسے اللہ تعالیٰ نے نگاہ حقیقت شناس عطا فرمائی تھی اور صدق و راستی سے معمور قلب بخشا تھا ایک دن اصل حقیقت کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ عربوں کی بے معنی بت پرستی، یونانیوں اور اہل یہود کے مذہبی مناظروں، روایاتِ قدیم اور فضول رسوم و رواجات کا مشاہدہ کرنے اور ان پر غور و فکر کرنے کے بعد اس نے یہ حقیقت افروز اعلان کیا کہ:۔

حضور اقدس ﷺ کا اعلان صداقت

"بتوں کی عبادت ایک لایعنی اور بیکار فعل ہے جس کا کچھ حاصل نہیں، لکڑی کے جن بتوں پر تم موم لگاتے اور تیل ملتے ہو یہ تو اپنے جسم پر بیٹھی ہوئی مکھیاں بھی نہیں اڑا سکتے۔ یہ محض کاٹھ کے ٹکڑے ہیں جو تمہارے لئے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔ انہیں پوجنا ایک مہمل کام اور نہایت گھٹیا شرک ہے اور کفر بھی۔ اگر تم ان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو تو تمہیں ان سے نفرت ہو جائے (یاد رکھو) ہمیشہ باقی رہنے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہی قوت و اقتدار کا حقیقی مالک (اور ان کا سرچشمہ) ہے۔ اسی نے ہمیں پیدا کیا، وہی ہمیں زندہ رکھتا اور وہی مارتا ہے (یعنی زندگی اور موت اسی کے دست اختیار میں ہے) "اللہ اکبر" ------! اللہ سب سے بڑا ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تمہارے حق میں وہی بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے چاہتا ہے خواہ وہ

> تمہیں (وقتی طور پر) کتنا ہی ناگوار لگے مگر جب غور کرو گے تو محسوس کرو گے کہ اسی کا چاہا ہوا تمہارے لئے سب سے بہتر تھا۔ تمہارے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو قبول کرو خواہ معاملہ دنیا کا ہو یا آخرت کا"۔

ہمارے لئے صرف حضور اقدس ﷺ کا پیغام ہی قابل قبول ہے

حضرت محمد ﷺ کے اس (لازوال) پیغام کو اگر عرب کے غیر متمدن بت پرستوں نے قبول کر لیا اور اپنے قلبِ تپیدہ میں جگہ دے کر اس پر عمل پیرا ہو گئے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس پر کسی قسم کے تعجب کا اظہار کیا جائے کیونکہ وہ اسی گرمجوشی سے قبول کئے جانے کے لائق تھا (اور اتنی صدیاں گذر جانے کے باوجود) آج بھی اگر کوئی ایسا پیغام ہے جو ہر شخص کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے تو وہ اسلام کا (یہی آفاقی) پیغام ہے جسے قبول کرنے والا شخص عالم روحانیت کا صدر نشین بن جاتا ہے' خالق ارض و سماوات کی طرف سے جاری ہونے والے احکام و فرامین کا ہم نوا و ہم آواز ہو جاتا ہے اور ان احکام و فرامین سے انحراف اور ان کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کی پیروی کرنے کو مقصد حیات بنا لیتا ہے۔ (اسلام کا) یہ وہ پیغام ہے جو انسان میں احساس فرض کی جوت جگا دیتا ہے اور میرے خیال میں اس کی کوئی دوسری مثال دنیا کے کسی مذہب و مسلک میں آج تک نظر نہیں آئی۔

عقیدہ تثلیث اور اسلام

عقیدہ تثلیث (تین خداؤں کا نظریہ) تو ذات و صفات کے بے معنی بحث و مناظرات میں الجھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس ساری بحث کا مدعا یہ ہے کہ مقصد کائنات کی حقیقت کو اجاگر کیا جائے لیکن اگر ان مباحث کے نتیجے میں یہ مقصد حاصل نہ ہو تو یہ ساری بحثیں لغو اور بے معنی ہیں جن کا کچھ حاصل نہیں۔ ان مباحث کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ (باپ' بیٹا' روح القدس کا) حقیقی مفہوم ظاہر کرنے کے لئے مناسب و موزوں الفاظ استعمال نہیں کئے گئے یعنی اظہار مقصد کے لئے صحیح الفاظ کا قالب مہیا نہیں ہو سکا اس لئے ان مباحث میں معنویت پیدا نہیں ہو سکی۔ اگر یہ استدلال تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اصل سوال یہ ہے کہ کیا آج کا انسان ذات و صفات کے بارے میں ان (مسیحی) نظریات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے؟ اسلام وہ مذہب ہے جس نے ان مہمل نظریات کو شکست دیدی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کا حق تھا کیونکہ اسلام اول سے آخر تک ایک ابدی حقیقت ہے جس کا چشمہ قلب فطرت سے پھوٹا تھا۔ عربوں کی بت پرستی ہو یا شام کے (مسیحی فرقوں کے) مشرکانہ عقائد ان سب کو اسلام کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا کیونکہ یہ صداقت سے تہی دامن تھے۔ ان بوسیدہ عقائد کی مثال خشک لکڑیوں کی تھی جو اسلام کی شعلہ صفت صداقت کے ہاتھوں جل کر راکھ ہو گئے۔

قرآنِ مقدس

جنگ و پیکار کے اسی دور میں خصوصاً مکہ سے ہجرت کے بعد جب حضرت محمد ﷺ اپنے عقائد و نظریات کی ترویج و اشاعت کے لئے جدوجہد کر رہے تھے آپ ﷺ نے وہ کتاب مقدس املا کرانی شروع کی جس کا نام قرآن ہے اور جس کے معنی ہیں پڑھی جانے والی کتاب۔ اس کتاب کو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے شاگردوں (صحابہ) نے غیر معمولی اہمیت دی اور دنیا کے سامنے ایک معجزے کی حیثیت سے پیش کیا۔ (یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ) مسلمان اس کتاب مقدس کو اس قدر عزت و احترام دیتے ہیں (کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی) شاید ہی کوئی مسیحی بائیبل کی اتنی تعظیم کرتا ہو۔ قرآن ہر مسلم معاشرے میں جملہ قوانین اور تمام اعمال کا معیار سمجھا جاتا ہے، اسے شمع ہدایت قرار دیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کے افکار و اعمال روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اسے وہ خصوصی پیغام الٰہی قرار دیا جاتا ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے قابل عمل ہے اور انہیں اس پر عمل کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کی عدالتوں میں تمام فیصلے اسی کی روشنی میں اور اس کے احکام کے مطابق کئے جاتے ہیں۔ ہر مسلمان اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ قرآن کی تعلیم حاصل کرے اور اپنی زندگی اس کے احکام کے مطابق گذارے۔ مساجد میں شب و روز اس کی تلاوت ہوتی ہے، تیس تیس علما جماعت وار ہر روز اس کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ بارہ سو سال (۱۸۴۰ء تک) گذر چکے ہیں کہ آج تک ہر وقت مسلمانوں کے دل و دماغ اس کتاب مقدس کی آواز سے گونجتے رہتے ہیں۔ عالم اسلام میں بعض ایسے عالم بھی گذرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں ستر ہزار بار اس کی تلاوت کا شرف حاصل کیا ہے۔ (۱)

قرآن کی اثر آفرینی

اختلاف مذاق کی بحث سے قطع نظر یہ بات بہت غور طلب ہے کہ آخر عربوں نے اسے ایک متاع عزیز سمجھ کر کیسے قبول کر لیا؟ (جو خود نہایت ہی فصیح و بلیغ لوگ تھے) اس پر ہرگز تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ آپ ایک بار قرآن کو اپنے ہاتھ سے رکھ دیجئے (یعنی خود کو قرآن کے اثر سے آزاد کر لیجئے اور بالکل خالی الذہن ہو جائیے) اور پھر اس پر غور کیجئے آپ محسوس کریں گے کہ یہ آپ کی روح میں اتر رہا ہے اور انکشاف حقائق کر رہا ہے۔ اس میں قرآن کی ادبی لطافت کا دخل نہیں ہے بلکہ یہ اس سے ماورا کوئی بات ہے۔ یہ دل سے نکلی ہوئی بات ہے جو دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس کے مقابلے میں کسی تحریر کی ادبی خوبی اور لفظی صنعت گری کی کوئی حقیقت نہیں۔ (۲)

---

(۱) اس کے بعد کارلائل نے قرآن شریف کی ترتیب اور اس کے اسلوب بیان پر تنقید کی ہے۔ یہ حصہ ہم نے یہاں سے حذف کر دیا ہے۔ اس بحث کو ہم کتاب کے آئندہ ایک باب میں درج کر کے انشاء اللہ اس پر اظہار خیال کریں گے۔

(۲) یہاں پہنچ کر کارلائل پھر بھٹک جاتا ہے اور وہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں مستشرقین کی غلط آراء کی تردید کرتے کرتے بعض جگہ ان کا ہم نوا بھی ہو جاتا ہے۔ یہ حصہ بھی ہم نے یہاں سے حذف کر کے آئندہ ایک الگ باب میں شامل کر دیا ہے اور پھر اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ (پیام)

حضورؐ اقدس کا ماحول جس میں قرآن نازل ہوا

حضرت محمد ﷺ کے بارے میں اظہار خیال کرتے وقت ہمیں یہ حقیقت ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ۲۳ سال کی اس مدت میں آپ ﷺ کو ایک طرف اپنے مخالفین سے جنگیں لڑنا پڑیں، پھر خود آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کا ایک گروہ (منافقین) ریشہ دوانیاں کرتا رہا۔ ان مخالفانہ حالات میں آپ مسلسل سرگرداں رہے اور آپ ﷺ کو سکون حاصل نہ ہو سکا۔ ان ایام میں جب آپ ﷺ کی مضطرب روح راتوں کی تنہائیوں میں مصروف غور و فکر ہوتی اور آپ ﷺ پر اپنے مسائل کا کوئی حل منکشف ہو جاتا تو آپ (بجا طور پر) خیال فرماتے کہ پردۂ غیب سے آپ ﷺ کو القا ہوا ہے اور جب آپ ﷺ کسی امر کا پختہ ارادہ کر لیتے تو یوں محسوس فرماتے جیسے آپ ﷺ پر جبریل وحی لے کر اترا ہے (اور آپ کا یہ احساس درست ہوتا تھا۔) کیا ایسا (صاف دل) شخص جعل ساز ہو سکتا ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں۔ آپ ﷺ کا قلب پرجوش جو حرارت افکار کی وجہ سے آتش کدے کی مانند دہک رہا تھا ان لوگوں کو ہرگز نصیب نہیں ہو سکتا جو دجل و فریب کرتے اور روحانی بازی گری کے کرتب دکھاتے ہیں۔

وہؐ اپنی زندگی کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا اور اس کائنات کی جلال آفریں حقیقت بھی اس کے سامنے عیاں ہو چکی تھی۔ وہ مادر فطرت کا ایک ایسا فرزند تھا جو دنیاوی تعلیم اور کسی مدرسہ کی تربیت کا منت کش نہ تھا۔ یہ بھی غلط نہیں کہ اس میں صحرائی باشندوں (بدوؤں) کے بعض خصائل بھی پائے جاتے تھے لیکن یہ کہنا قطعاً غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ اس نے کوئی بہروپ بھرا تھا اور وہ دل بینا سے محروم ایسا شخص تھا جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر فریب کاری کرتا اور خود ہی وحی و الہام گھڑ کر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا تھا، یوں جعلی آسمانی صحائف بنا کر اپنی ذات اور اپنے خدا دونوں سے غداری کا مرتکب ہوتا تھا؟----- نہیں ہرگز نہیں، یہ سراسر غلط ہے۔

قرآن کا خلوص

اگر خلوص کو وسیع ترین معنی کے تناظر میں دیکھا جائے تو میرے خیال میں یہ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یہی خلوص ہے جو عربوں کو بہت محبوب تھا۔ یہی خلوص قرآن کا سب سے بڑا وصف اور جوہر ہے جس سے بے شمار خوبیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ ہر خوبی اسی ایک خوبی سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک بات پر بہت حیرت ہوتی ہے اگرچہ قرآن میں (بظاہر) ایسے مطالب ہیں جن میں ربط نظر نہیں آتا مگر اس کے باوجود اس میں ایسی سچائی اور بصیرت جھلکتی ہے جسے شعری لطافت کے سوائے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا ایک بڑا حصہ سابقہ زمانوں کے قصص و حکایات پر مشتمل ہے اور یہ روایات اس انداز سے بیان کی گئی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پہلے سے کسی سوچ بچار کے بغیر (پیغمبر ﷺ کے قلب پر) وارد ہو رہی ہوں اور نہایت دلسوزی سے تعلیم کی جا رہی ہوں۔ اس میں ان پیغمبروں کے حالات تکرار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جن سے عرب لوگ واقف تھے مثال کے طور پر بتایا گیا ہے کہ دنیا کی مختلف اقوام کی رہنمائی اور انہیں ہدایت دینے کی غرض سے یکے بعد دیگرے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے، جیسے حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہودؑ اور حضرت موسیٰؑ۔ ان پیغمبروں کے ساتھ ان کی قوموں نے بالکل ویسا ہی سلوک کیا جیسا سلوک (حضرت) محمدؐ کے ساتھ ان کی قوم کر رہی تھی۔ گذشتہ انبیاء کے ساتھ ان کی قوموں کی بدسلوکی کے یہ واقعات (بلاشبہ حضرت) محمد ﷺ کے لئے تسلی کا باعث ہوتے ہوں گے (کہ ہر زمانے کے نبی کے ساتھ یہ ہوتا چلا آیا ہے اور یہ امر بھی انبیاء کی صداقت کی ایک دلیل ہوتا ہے۔

ان کی قوم ہی ان کی مخالفت کرتی ہے) اور قرآن کا بیشتر حصہ انہی واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود یہ دیکھ کر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ قرآن میں حقائق کی ایسی جلوہ سامانیاں بھی نظر آتی ہیں جو ایک بلند نظر مفکر حقیقی ہی میں پائی جاتی ہیں۔ دراصل (حضرت) محمد ﷺ پر اس کائنات کے حقائق پوری طرح منکشف ہو چکے تھے یہی وجہ ہے کہ یہ اسرار و رموز جن سے، آپ ﷺ کا قلب مبارک روشن تھا نہایت سلیس پیرایہ ء اظہار میں آپ ﷺ ہمارے قلوب میں بھی اتار دیتے تھے۔

حضور اقدس ﷺ کا معجزہ

(حضرت) محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کی ہیں اور جس طرح اس کی حمد کی ہے بہت سے لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں لیکن اس کی بجائے جو چیز مجھے متاثر کرتی ہے وہ ہے (حضرت) محمد ﷺ کی وہ حقیقت بیں نظر جو اشیائے کائنات کی انتہائی گہرائی میں اتر کر ان کی اصل اور ماہیئت کو پالیتی ہے۔ یہ قدرت کا سب سے بڑا عطیہ ہے جو وہ سب کو عطا کرتی ہے مگر اس سے کام لاکھوں کروڑوں میں سے کوئی ایک ہی لیتا ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جسے میں صحت نظر کا نام دیتا ہوں اور یہی وہ معیار ہے جس سے قلب صادق شناخت کیا جاتا ہے۔

(حضرت) محمد ﷺ نے معجزے نہیں دکھائے بلکہ متعدد مواقع پر آپ ﷺ نے برملا کہہ دیا کہ میں معجزے نہیں دکھایا کرتا، میں تو معلم اخلاق ہوں اور میرا کام اس تعلیم کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ تاہم آپ ﷺ اس کائنات کو ایک معجزہ ہی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ فرمایا کہ:

> "اس کائنات کو غور سے دیکھو، کیا یہ انتہائی عجیب اور حسین و جمیل نہیں؟ یہ اللہ کی تخلیق ہے، یہ اس کی صنعت گری کا شاہکار ہے۔ اگر تمہیں نگاہ حقیقت شناس عطا ہوئی ہے تو خود

> محسوس کرو گے کہ یہ بہت بڑا معجزہ ہے۔ خدا نے یہ زمین تمہارے لئے بنائی ہے تاکہ تم اس میں زندگی گذارو، اس نے اس میں راستے بنائے ہیں تاکہ اس میں چل پھر سکو"۔(۳)

عرب جیسے گرم و خشک ملک میں بادلوں کے امنڈ امنڈ کر آنے کا منظر بہت عجیب ہوتا ہے چنانچہ (حضرت) محمد ﷺ فرماتے ہیں کہ:۔

> "بادلوں (کو دیکھو) جو دور ------- آسمان کی گہرائیوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ آخر یہ کہاں سے آتے ہیں؟ ابر سیاہ کے یہ دَل کے دَل آسمان پر جمع ہونا شروع ہوتے ہیں اور پھر برس پڑتے ہیں جس کے نتیجے میں مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، سبزہ لہلہا اٹھتا ہے۔ کھجوروں کے بلند و بالا اور تناور درخت پیدا ہوتے ہیں جن کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوتی ہیں۔ کیا یہ سب کسی معجزے سے کم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مویشی بھی پیدا کئے ہیں جنہیں اس نے تمہاری خدمت پر لگا دیا ہے۔ یہ گھاس کھاتے ہیں اور اس سے تمہارے لئے دودھ بناتے ہیں۔ تم ان سے (غذا اور) لباس بھی حاصل کرتے ہو۔ شام کے وقت جب وہ چراگاہوں سے قطار در قطار تمہارے گھروں کو لوٹتے ہیں تو اس میں تمہارے لئے

---

(۳) یہ ارشادات حضور ﷺ اقدس کے نہیں بلکہ یہ وحی الہیٰ کے مختلف حصے ہیں ہے جو "وقتاً فوقتاً" آپ ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ (پیام)

> (منافع اور) زینت کا سامان ہوتا ہے"۔

(حضرت) محمد ﷺ نے جہازوں کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

> "وہ بڑے بڑے (بادبانی جہاز) متحرک پہاڑوں کی مانند کپڑوں کے پر پھیلائے سطح آب پر رواں دواں ہیں۔ وہ ہوا کے زور سے چلتے ہیں مگر جب اللہ تعالیٰ ہوا کو روک دیتا ہے تو وہ بھی ٹھہر جاتے ہیں اور پھر حرکت نہیں کر سکتے"۔

قرآن میں انسانی تخلیق کا بیان

آپ ﷺ معجزات کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> "تم کس قسم کے معجزے دیکھنے کے خواہشمند ہو؟ کیا تم خود اپنی ذات میں ایک معجزہ نہیں ہو (دیکھو) اللہ تعالیٰ نے (ابتدا میں) تمہیں تھوڑی سی مٹی سے تخلیق کیا۔ اس سے پہلے انسان کا وجود تک نہ تھا۔ پیدائش کے وقت تم بہت کمزور و ناتواں تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ تم میں حسن اور طاقت و توانائی پیدا ہوئی، تمہارا شعور بیدار ہوا تم میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نے جنم لیا۔ پھر تم پر ایک ایسا دور آتا ہے جب تم بوڑھے ہو جاتے ہو، تمہارے بال سفید ہو جاتے ہیں، تمہاری توانائیاں ختم ہونے لگتی ہیں اور تم کمزور ہو کر آخر ایک دن موت کی وادی میں جا اترتے ہو"۔

مجھے (حضرت) محمد ﷺ کے ارشادات میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد بہت پسند آیا، آپ فرماتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا اگر وہ تمہیں اس جذبہ سے محروم رکھتا تو تمہارا کیا حال ہوتا"۔

بلاشبہ ان الفاظ میں ایک ایسا خیال پیش کیا گیا ہے جو نہایت اعلیٰ اور نادر ہے۔ اشیا اور معاملات کو حقیقت بینی سے دیکھنے کی ایک اچھوتی مثال ہے۔

قرآن کا شعری حسن

(حضرت) محمد ﷺ (اگرچہ شاعر نہ تھے مگر آپ ﷺ) کے اسلوب بیان اور طرز ادا میں بہترین شاعرانہ کمالات پائے جاتے تھے۔ آپ ﷺ کا دل صادق ترین خیالات کی آماجگاہ تھا۔ آپ ﷺ کو ایسی اعلیٰ درجے کی ذہانت و بصیرت اور دل و دماغ ودیعت کئے گئے تھے کہ اگر آپ چاہتے تو شاعری میں نام پیدا کر سکتے تھے، بادشاہی حاصل کر سکتے تھے، کاہن بن سکتے تھے، غرض زندگی کے جس شعبے میں چاہتے ناموری حاصل کر سکتے تھے۔

آپ ﷺ پر یہ حقیقت ہمیشہ عیاں رہی کہ یہ ساری کائنات ایک معجزہ ہے۔ یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اگرچہ مادی ہے جو ہمیں ایک حقیقت کی طرح نظر آتا ہے لیکن دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے غیر مرئی وجود کا-----، اس کی قدرت کا ایک نظر آنے والا مظہر ہے جیسا کہ اسکنڈے نیویا کے ارباب فکر و نظر اور بعض دوسرے مفکرین کی بھی رائے تھی۔ اس مادی عالم رنگ و بو کے بارے میں آپ ﷺ کی رائے تھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی غیر مرئی ذات کا ایک پرتو ہے جو فضا کے سینۂ عریاں پر نظر آ رہا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔

> "آسمان سے باتیں کرتے ہوئے یہ بلند و بالا پہاڑ ایک دن ٹوٹ پھوٹ کر ابر پاروں کی طرح آسمان کی پہنائیوں میں گم ہو جائیں گے"۔

(انگریزی مترجم قرآن) جارج سیل نے لکھا ہے کہ (حضرت) محمد ﷺ عربوں کے عقیدے کے مطابق زمین کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے تھے کہ (یہ گول نہیں بلکہ) چوڑی چکلی ہے۔ (۴) اسے قائم رکھنے اور اس کی مضبوطی کے لئے اس میں پہاڑ بنائے ہیں، قیامت کے دن یہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح (بادلوں کی مانند) منتشر ہو جائیں گے اور زمین اس قدر چکرائے گی کہ ٹوٹ پھوٹ کر اور ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی صورت خلا میں تحلیل ہو جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر سے حفاظت کا ہاتھ اٹھا چکا ہو گا پس وہ اس کی توجہ سے محروم ہو کر فنا ہو جائے گی۔

حضور اقدس ﷺ پر عظیم انکشاف

(حضرت) محمد ﷺ پر یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو چکی تھی کہ اس کائنات کے ذرے ذرے پر اللہ تعالیٰ کا اقتدار قائم ہے اور کوئی چیز اس کے دائرۂ حاکمیت سے باہر نہیں۔ بالفاظ دیگر آپ ﷺ کو کامل ادراک حاصل ہو چکا تھا کہ تمام اشیائے عالم کی اصل طاقت ایک ایسے ناقابل بیان روح اور جوہر کی حیثیت سے ہر جگہ اپنی قوت و جبروت اور عظمت کے ساتھ موجود ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا یہی وہ چیز ہے جو آج کے عہد میں قوانین قدرت اور اصول فطرت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے جسے (بدقسمتی سے) عہد موجودہ کوئی آسمانی چیز تسلیم نہیں کرتا، وہ تو بطور ایک شے اسے تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ اسے بہت سی اشیا کا ایک مجموعہ تصور کیا جاتا ہے جن

میں صفات الٰہی کا کہیں گذر نہیں۔ جدید علوم و فنون کی چکاچوند میں اندیشہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ خدا ہی کو بھول جائیں۔ اگر ہم نے اسے ہی بھلا دیا تو میرے خیال میں کون سی چیز دنیا میں ایسی باقی رہ جائے گی جسے یاد رکھا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ سارے علوم و فنون بے مصرف، بے معنی اور مردہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان کے بغیر اعلیٰ درجے کے علوم بھی محض خشک لکڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سبز درختوں کی طرح نہیں ہو سکتے جن سے نئی لکڑی مہیا ہوتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لائے بغیر، اس کی طرف توجہ کئے بغیر اور اس سے معبودانہ تعلق قائم کئے بغیر انسان کچھ نہیں جان سکتا اور اس کا سارا علم بیکار ہے۔

اسلام عیش و عشرت کا مذہب نہیں

ہمارے ہاں (یعنی مسیحی دنیا میں) حضرت محمدؐ کے مذہب کی حرص و ہوس اور شہوت پرستیوں کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے لیکن وہ حقیقت سے زیادہ مبالغہ آرائی پر مبنی ہے۔ وہ امور جنہیں ہم ہوس پرستی کہتے ہیں اور (ہمارے خیال میں) اسلام جن کی اجازت دیتا ہے وہ (حضرت) محمد ﷺ کے رائج کردہ نہیں بلکہ اسلام سے قبل عربوں میں کھلم کھلا رائج تھے (جیسے ایک سے زیادہ بیویاں) حضرت محمدؐ نے انہیں مختلف طریقوں سے محدود اور پابند کر دیا۔ اسلام اتنا آسان مذہب نہیں۔ روزوں کی پابندی، دن اور رات میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت کا اہتمام، جسم اور لباس کی پاکیزگی کا خیال رکھنے کا حکم، شراب سے "کلیتہ" پرہیز۔ یہ وہ احکام و فرائض ہیں جن پر عمل کرنے کا ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے۔ ان سخت پابندیوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام لوگوں میں اس لئے مقبول ہوا کہ وہ اپنے پیروکاروں کے لئے آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ صرف اسلام ہی پر منحصر نہیں، دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو محض اس لئے مقبول ہو گیا ہو کہ اس

---

(۴) قطعاً" غلط ہے جارج سیل نے قرآن شریف کے ترجمے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں اور رسول ﷺ اقدس اور قرآن شریف کے بارے میں خودساختہ آرا ظاہر کی ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے زمین کو کبھی چوڑی چکلی نہیں کہا نہ قرآن نے ایسا کہا۔ (پیام)

پر عمل کرنا آسان تھا۔ میرے خیال میں یہ کہنا نسل آدم کی توہین ہے کہ انسان محض عیش و عشرت، صلے کے لالچ یا شراب و شہد کی خاطر اعمال نیک سرانجام دیتا ہے خواہ یہ چیزیں اسے دنیا میں حاصل ہوں یا آخرت میں۔ ذلیل سے ذلیل انسان میں بھی شرافت کی کچھ نہ کچھ رمق ضرور ہوتی ہے۔ ایک غریب سپاہی بھی جو صرف گولی کھانے کے لئے ملازم رکھا جاتا ہے ایک خاص عزت کا حامل ہوتا ہے جو اس کی معمولی سی تنخواہ اور فوجی سرگرمیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابل لحاظ ہوتی ہے (کیونکہ اس کے پیش نظر مادر وطن کا دفاع بھی تو ہوتا ہے) نسل آدم کے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کا دل بھی جس چیز کی تمنا سے سرشار رہتا ہے وہ لذت کام و دہن نہیں بلکہ شریفانہ اور پاکیزہ زندگی گذارنے کا وہ جذبہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اللہ کے ایک نیک بندے کی حیثیت سے اللہ کی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ آپ اسے ایک بار بتا دیجئے کہ یہ راستہ ہے جو جنت کو جاتا ہے آپ دیکھیں گے کہ ایک ست گام شخص بھی کس مقام بلند پر پہنچ جاتا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ پر تعیش زندگی کا لالچ دے کر انسان کو اعمال نیک سرانجام دینے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے وہ نسل انسانی سے سخت ناانصافی کرتے ہیں، مصائب و آلام، ایثار و قربانی اور بلند مقصد کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کر دینا ایسے محرکات ہیں جن سے قلب انسانی متاثر ہوتا ہے اور نیکی کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے اندر جو شعلہ خوابیدہ ہوتا ہے اگر اسے بیدار کر دیا جائے تو وہ تمام غیر انسانی اور غیر صالح آلائشوں کو جلا ڈالے گا۔ پس ماندہ معاشروں میں بھی ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کے کارنامے عیش و شادمانی کی طمع میں انجام پذیر نہیں ہوئے بلکہ ان کے پیچھے بہت اعلیٰ ترغیبات تھیں۔ کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ محض اس لئے نہیں ہوا کہ وہاں کھانے کو بہت ملتا تھا بلکہ یہ اضافہ قلب انسانی میں پائے جانے والے اعلیٰ و ارفع جذبات کو ابھارنے کی وجہ سے ہوا جو ہر انسان کے قلب میں موجود ہوتے ہیں (جنہیں سلیقے سے بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے)

حضورؐ اقدس کی شخصیّت

حضورؐ اقدس کا دامن حرص و ہوس سے پاک تھا

(مختصر یہ کہ) خواہ کوئی کچھ کہے کم از کم (حضرت) محمد ﷺ کے دامن پر حرص و ہوس اور تن آسانی کا ذرا سا بھی دھبہ نہیں لگایا جا سکتا۔ نہ صرف ادنیٰ درجے کے عیش و عشرت سے آپ ﷺ کا دامن آلودہ نہیں تھا بلکہ سرے سے عیش و عشرت کا شائبہ تک آپ ﷺ کی زندگی میں نہیں پایا جاتا تھا، اگر کوئی اس کے برعکس سوچتا یا کہتا ہے تو یہ اس کی سخت غلطی ہے (آپ خود غور کیجئے کہ) حضرت محمد ﷺ کے گھر کا سامان بہت ہی معمولی درجے کا تھا (حالانکہ آپ ﷺ سارے عرب کے بادشاہ ہو چکے تھے) ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی مہینے آپ ﷺ کے گھر میں چولھا بھی نہ جلتا (اور چند کھجوریں یا مٹھی بھر ستو پانی میں گھول کر روز و شب گذار لئے جاتے) عام طور پر جو کی روٹی آپ ﷺ کی غذا تھی جو آپ ﷺ پانی سے تناول فرما لیتے تھے۔ عرب مؤرخ بطور فخر لکھتے ہیں اور (بلاشبہ) وہ فخر کرنے میں حق بجانب ہیں کہ:۔

> "(حضرت) محمد ﷺ اپنے جوتے کی خود مرمت کر لیتے اور خود
> ہی اپنے لباس میں پیوند لگا لیتے"۔

آپ ﷺ ایک غریب مگر جفاکش انسان تھے، آپ ﷺ نے ساری زندگی تنگدستی میں گذاری، کبھی محنت کرنے میں عار محسوس نہیں کی۔ مجھے کہنا چاہئے کہ برائی حضرت محمدؐ کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ (یقیناً) آپ ﷺ میں خواہشات جسمانی سے ماورا کوئی ایسا جذبہ کار فرما تھا (جس نے لوگوں کو آپ ﷺ کا گرویدہ بنا دیا تھا) ورنہ وہ درشت مزاج اور اکھڑ عرب جو ۲۳ سال تک آپ ﷺ کے پرچم تلے آپ ﷺ کے دشمنوں سے لڑتے رہے اور جنہیں ہمہ وقت آپؐ کے ساتھ رہنے اور آپ ﷺ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا وہ کبھی آپ کی اس قدر عزت و تکریم نہ کرتے، یہ بہت ہی شعلہ خو لوگ تھے جو معمولی معمولی باتوں پر مشتعل ہو کر آمادۂ فساد ہو جاتے، ایسے لوگوں پر وہی شخص حکومت کر سکتا ہے جس میں راستی کا جوہر اور (غیر معمولی اخلاقی) جرات ہو۔

(غور کیجئے کہ) حضرت محمد ﷺ کسی تصنع، بناوٹ اور ظاہری طمطراق کے بغیر بالکل سادہ حالت میں اپنے عرب پیروکاروں کے سامنے آتے تھے، انہوں نے آپ ﷺ کو اپنی عبا میں پیوند لگاتے اور اپنے جوتے مرمت کرتے دیکھا، میدان جنگ میں شمشیر زنی کرتے اور مشوروں کی مجالس میں بیٹھے دیکھا، اس کے باوجود انہوں نے آپ ﷺ کو پیغمبر تسلیم کیا (تو یقیناً) انہوں نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ آپ ﷺ کس مقام و مرتبہ کے انسان تھے؟ آج آپ ﷺ کے بارے میں ہم جو چاہیں کہہ سکتے ہیں مگر آج تک کسی بادشاہ نے جواہرات سے مزین تاج زریں پہن کر لوگوں پر اس شان سے ہرگز حکمرانی نہیں کی ہو گی جس طرح کسی تخت و تاج کے بغیر اس درویشؐ عبا پوش نے اکھڑ عربوں پر حکومت کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک مرد عظیم میں جو اوصاف و کمالات ہوتے ہیں وہ سب حضرت محمد ﷺ کی ذات میں موجود تھے (بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر) انہی اوصاف کی بدولت آپ ﷺ ۲۳ سال تک سخت ترین آزمائشوں سے گذر کر فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔

حضورؐ اقدس کا دل دردمند

آپ ﷺ کی زبان مبارک سے جو آخری الفاظ ادا ہوئے وہ اپنے رب کریم کے حضور عالم اضطراب میں ایک دعا ہے ----- ایک دل بے قرار کی دعا! ----- یہ کہنا غلط ہے کہ اپنے دین کی اشاعت و مقبولیت نے حضرت محمد ﷺ کے مزاج اور سیرت پر کوئی برا اثر ڈالا (اور آپ ﷺ میں کوئی تکبر پیدا ہو گیا) ہرگز نہیں بلکہ اس کا آپ ﷺ کے قلب پر نہایت اچھا اثر ہوا (اور آپ ﷺ کی شخصیت کا جوہر اور نکھر آیا) آپ ﷺ کے حالات زندگی کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ تو بہت ہی قابل تعریف ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی صاجزادی (ا) کی وفات کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنے مخصوص انداز میں جو الفاظ کہے وہ نہ صرف اپنے اندر ایک بہت بڑی صداقت رکھتے ہیں بلکہ ان میں مسیحی عقائد سے بھی مشابہت پائی جاتی ہے، یعنی ----- "اللہ کی دی ہوئی چیز تھی، اللہ نے لے لی، اس پر اللہ کی رحمت ہو"۔ یہی الفاظ آپ ﷺ نے اس وقت ادا فرمائے تھے جب آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام (حضرت) زیدؓ کا انتقال ہوا جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والوں میں سے دوسرے شخص تھے اور جنہیں آپ ﷺ بہت محبوب رکھتے تھے۔ حضرت زیدؓ معرکہ تبوک میں کام آئے تھے جو رومی (۲) فوجوں سے آپ ﷺ کی پہلی لڑائی تھی۔ ان کے واقعہ ء شہادت کی خبر سن کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ----- "زید کا انجام بہت اچھا ہوا، وہ اللہ کی راہ میں مارے گئے، وہ اپنے مالک کے پاس چلے گئے"۔ اس کے باوجود آپ ﷺ حضرت زیدؓ کی لاش پر رو رہے تھے۔ سفیدی مائل بالوں والی اس سن رسیدہ مقدس ہستیؐ کو آنسو بہاتے دیکھ کر زیدؓ کی بیٹی نے کہا، (کارلائل کے الفاظ میں)

(WHAT DO I SEE?)

"میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں"۔ آپؐ نے جواب دیا کہ -----

"YOU SEE A FRIEND WEEPING OVER HIS FRIEND." (P-306)

(تم ایک دوست کو اس کے دوست کے لئے روتا دیکھ رہی ہو"۔

اپنے انتقال سے دو دن پہلے آپ ﷺ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اگر کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میری پیٹھ تازیانے کے لئے حاضر ہے، اگر میرے ذمہ کسی کا کوئی قرض ہو تو مجھ سے طلب کر لے ---- ایک آواز بلند ہوئی ----- "ہاں! فلاں روز آپ نے مجھ سے تین درہم بطور قرض لئے تھے"۔ آپ ﷺ نے (اپنے اہل بیت سے) فرمایا "اس کا قرض ادا کر دیا جائے" اور ساتھ ہی فرمایا کہ "آج کی شرمندگی یوم حساب کی شرمندگی سے کہیں بہتر ہے"۔

(ا) پروفیسر مہدی حسین ناصری صاحب لکھنوی نے اپنی کتاب "سرور انبیا" میں یوں ترجمہ کیا ہے کہ ---- "جب آپؐ کے صاجزادے کا انتقال ہوا" ----- جبکہ ہم نے "صاجزادی" ترجمہ کیا ہے شاید اس طرح لوگوں کو گمان گزرے کہ ہم نے دانستہ غلط ترجمہ کر دیا ہے۔ سو بطور وضاحت عرض ہے کہ ہم نے وہی لکھا جو کارلائل نے لکھا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں ----

WHEN HE LOST HIS DAUGHTER. (P-305)

(یعنی جب آپؐ کی دختر کا انتقال ہوا) (پیام)

---

(۲) یہاں بھی کارلائل سے سہو ہو گیا اور انہوں نے معرکہ تبوک کو مسلمانوں اور یونانیوں کی جنگ لکھ دیا۔ ہم نے ترجمے میں درست کر دیا ہے یہ جنگ مسلمانوں اور رومی فوجوں کے درمیان ہوئی تھی۔ (پیام)

(قارئین کرام!) آپ کو یاد ہوگا کہ ایک روز جب حضرت عائشہؓ نے حضور اقدس ﷺ سے دریافت کیا کہ "آپ کو خدیجہؓ زیادہ عزیز ہیں یا میں؟" تو آپ ﷺ نے (بلا تامل) فرمایا کہ "خدا کی قسم تمہارے مقابلے میں مجھے خدیجہؓ زیادہ عزیز ہے"۔ (حالانکہ بیوہ اور ضعیف خدیجہؓ کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کنواری' نوجوان اور بہت خوبصورت تھیں)

حضور اقدس ﷺ کی حقیقت پسندی

یہ وہ شواہد ہیں جو آج (۱۸۴۰ء میں) بارہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ہمیں اس مرد عظیم کی صداقت شعاری کی یاد دلاتے ہیں جس کے ہم جنس ہونے کا ہم سب کو شرف حاصل ہے۔ مزید بر آں مجھے حضرت محمد ﷺ کا ظاہرداری اور بناوٹ سے مکمل طور پر پاک ہونا بہت پسند ہے۔ آغوش صحرا میں پرورش پانے والا یہ فرزند امی اپنی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے کام کرتا ہے اور اپنے بارے میں کبھی وہ بات نہیں کہتا جو اس میں نہ پائی جاتی ہو (یعنی خود کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرتا) نہ تو اس کے اندر خود نمائی اور تکبر کا جذبہ ہے اور نہ وہ خود کو بہت عاجز اور خوشامدی بنا کر پیش کرتا ہے بلکہ وہ ہمیں اپنی اصل حالت میں نظر آتا ہے۔ ایک جانب تو ہم اسے اپنی عبا میں پیوند لگاتا اور اپنا جوتا خود مرمت کرتا ہوا پاتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری طرف اسے ایران اور یونان کے حکمرانوں کو نہایت بے باکی اور بے خوفی سے ان کے فرائض یاد دلاتا ہوا دیکھتے ہیں۔ گویا وہ اپنے مقام و مرتبہ اور اپنے وقار کا پورا خیال و ادراک رکھتا ہے۔ بدوؤں کے ساتھ جنگ و پیکار میں سفاکانہ تیغ زنی کے بغیر چارۂ کار نہیں اس کے باوجود ہم حضرت محمد ﷺ کو ان جنگوں میں بھی رحم دلی کا مظاہرہ کرتے دیکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نہ تو ان جنگوں میں پیش آنے والے سفاکانہ واقعات پر معذرت کرتے ہیں نہ رحم دلانہ واقعات پر فخرو مباہات کا اظہار فرماتے ہیں۔ سختی اور رحم یہ دونوں پہلو دراصل دو آوازیں تھیں جو آپ ﷺ کے قلب صافی سے بے ساختہ بلند ہوئیں (گویا آپ ﷺ نے ہمیں بتایا کہ بعض حالات میں سخت گیری ہی مسئلے کا حل ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود رحم دلی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے)۔

آپ ﷺ نے ہر موقع پر شیریں بیانی اختیار نہیں کی بلکہ وقت اور موقع کی مناسبت سے سختی اور نرمی دونوں سے کام لیا۔ آپ ﷺ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے غزوۂ تبوک کا متعدد بار ذکر کیا ہے۔ اس جنگ میں آپ ﷺ کے ساتھ جانے سے بہت سے لوگوں نے انکار کر دیا تھا' ان کا عذر یہ تھا کہ موسم بہت گرم ہے اور ان کی فصلیں پک چکی ہیں جو کٹنے کے لئے تیار ہیں۔ آنحضرت ﷺ اس واقعے کو کبھی فراموش نہیں کر سکے چنانچہ فرمایا کہ -----"تمہاری یہ کھیتیاں کب تک باقی رہیں گی۔ ہاں گرمی؟ بے شک گرمی تو بہت سخت تھی لیکن دوزخ کی گرمی اس گرمی سے کہیں زیادہ شدید تر ہوگی۔"(۳)

کبھی کبھی آپ ﷺ طنز سے بھی کام لیا کرتے تھے چنانچہ اپنا انکار کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

-----"روز حساب تمہیں تمہارے اعمال کا پورا صلہ مل جائے گا' تمہارے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور ان میں ذرا سی بھی کمی نہیں کی جائے گی۔" آپ ﷺ ہر بات کی حقیقت کو چشم تصور سے دیکھ لیتے۔ ان امور کی عظمت کی وجہ سے بعض مرتبہ آپ ﷺ کا جسم ساکت وصامت ہو جاتا۔ (اپنے اعتقادات و نظریات کی پختگی کا

---

(۳) یہ حضورؐ اقدس کا ارشاد نہیں قرآن کا ارشاد ہے۔ (پیام)

اظہار کرنے کی غرض سے) آپ ﷺ اکثر مواقع پر "بے شک" کا لفظ استعمال فرمایا کرتے تھے بلکہ قرآن میں تو بعض مقامات پر یہ لفظ ایک مستقل جملہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ----- "بے شک"۔

زندگی کے بارے میں حضورؐ اقدس کا نظریہ

حضرت محمد ﷺ زندگی کو کھیل تماشہ نہیں سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ کے نزدیک یہ راہ پانے اور راہ گم کر دینے کا معاملہ تھا' یہ ازل اور ابد کا مسئلہ تھا جسے آپ ﷺ بے حد سنجیدگی سے دیکھتے تھے۔ زندگی کو ہنسی کھیل خیال کرنا' اس کے بارے میں قیاس آرائی سے کام لینا' حق کی تلاش میں بے پروائی برتنا اور صداقت کے بارے میں تمسخر آمیز رویہ اختیار کرنا گناہ عظیم ہے' سارے گناہ اسی سے جنم لیتے ہیں۔ یہ جذبہ اسی شخص کے دل میں راہ پاتا ہے جس کے پاس سے صداقت ہو کر بھی نہ گذری ہو' جو ہروقت نمود و نمائش کے پیچھے بھاگتا ہو' ایسا شخص نہ صرف جھوٹ گھڑتا اور جھوٹ پھیلاتا ہے بلکہ خود بھی سراپا کذب ہے' گویا اس کا سینہ اخلاق عالیہ کے شعلہ سرمدی سے محروم ہو چکا ہے اور وہ محض انبار خاکستر ہے۔ ایسا شخص ایک ریاکار انسان ہے' خواہ وہ دیکھنے میں معقول اور مہذب و شائستہ ہو' اس کی خوش کلامی زہریلے سانپ کی مانند ہے جو اگرچہ بظاہر خوبصورت نظر آتا ہے مگر زہر سے بھرا ہوا ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے اصولوں کا رخ ہمیشہ (بنی نوع انسان کی) خیر و فلاح کی طرف رہتا تھا(۴) یہ اصول ایک ایسے قلب کے پاکیزہ احساسات ہیں جن کے پیش نظر ہمیشہ راستی اور صدق و عدل رہتا ہے۔ اگرچہ اسلام کی تعلیم میں مسیحی تعلیم کا یہ ارفع اصول نہیں ملتا کہ ----- "اگر کوئی شخص تمہارے ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے پھیر دو" ----- بلکہ اس کے برعکس اسلام انتقام لینے پر زور دیتا ہے تاہم یہ شرط بھی عائد کرتا ہے کہ بدلہ لیتے ہوئے حدود انصاف کو نہ توڑا جائے۔ اسی طرح فطرت انسانی کے ایک حقیقی نباض اور ایک عظیم مذہب کے داعی کی حیثیت سے وہ مکمل مساوات کا درس دیتا ہے۔ اسلام کی تعلیم کی رو سے ایک مسلمان کی جان (۵) دنیا بھر کے تاج و سلطنت سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اور اس کے نزدیک دنیا کے تمام انسان (بلا تفریق مذہب و نسل) یکساں احترام کے مستحق ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ مذہب اسلام زکوٰۃ و خیرات کرنے کو صرف ایک خود اختیاری فعل قرار نہیں دیتا بلکہ اس کا حکم دیتا ہے اور اس کی حیثیت ایک فرض کی ہے جس کے ادا نہ کرنے پر گرفت کی جاتی ہے۔ اس کا ضابطہ

---

(۴) کارلائل کے الفاظ کا اصل ترجمہ تو یہ ہے کہ ----- "ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ حضرت محمد ﷺ کے اخلاقی اصول و ضوابط ہمیشہ ہی بہترین ہوا کرتے تھے لیکن ان کا رخ ہمیشہ خیر و فلاح کی طرف رہتا تھا" لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کارلائل کی اس رائے کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں خود تاریخ شہادت دیتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کا ہر اخلاقی اصول روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے جس سے نہ صرف مسلمان بلکہ اگر چاہیں تو غیر مسلم بھی قیامت تک رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ (پیام)

(۵) مسلمان کی نہیں بلکہ انسان کی جان' خوہ اس کا مذہب و مسلک کچھ بھی ہو۔ (پیام)

اور پیمانہ بھی مقرر کر دیا گیا ہے جو سالانہ آمد کا(٦) ۱۰/۱ حصہ ہے، یہ غربا و مساکین اور محتاج طبقے کو بطور ان کے حق کے ادا کیا جائے گا۔ بلاشبہ یہ نہایت اعلیٰ درجے کے ضوابط ہیں، یہ جذبہ ء رحم و شفقت، عدل و انصاف اور محبت و انسانیت کی پکار ہیں -----اس قلب نازک کی آواز ہیں جو مادر گیتی کے فرزند امی (حضرت محمد ﷺ) کے سینے میں دھڑک رہا تھا۔

---

(٦) یہاں مسٹر کارلائل سے سہو ہو گیا، آمدنی کا دسواں حصہ صرف زرعی پیداوار پر مقرر کیا گیا ہے ہر قسم کی پیداوار پر نہیں۔ پیداوار کی دیگر اقسام کے لئے الگ الگ ضابطے مقرر کئے گئے ہیں۔

اسلام کا پیغام

اس میں شک نہیں کہ (حضرت) محمدؐ کا مذہب جنت و جہنم کا ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جس میں حیوانیت پائی جاتی ہے اور جو ہمارے روحانی احساسات کو بری طرح مجروح کرتا ہے(۱) لیکن یہ حقیقت ضرور پیش نظر رکھنی چاہئے کہ یہ تصورات جنت و جہنم اسلام کے نہیں ہیں بلکہ عربوں میں پہلے سے پائے جاتے تھے (حضرت) محمد ﷺ نے ان میں مناسب ردوبدل کر کے انہیں معقول بنا دیا۔

اسلام کا تصور جنت

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ جنت کی یہ حیوانی لذتیں اور دوزخ کے یہ ہولناک اور دہشت انگیز عذاب جن کی اسلام تصویر پیش کرتا ہے حضرت محمد ﷺ نے پیش نہیں کئے بلکہ امت مسلمہ کے بعض علما نے پیش کئے ہیں۔ قرآن شریف میں جنت کی نعمتوں کا ذکر نہایت اختصار سے کیا گیا ہے جو اجمالی ہے تفصیلی ہرگز نہیں (تفصیلات مفسرین نے بیان کی ہیں جنہیں اسلام کی طرف منسوب کر دیا گیا) اس اجمال میں بھی اہمیت اس حقیقت کو دی گئی ہے کہ بہشت کی سب سے بڑی اور

---

(۱) یہاں بھی کارلائل سے سہو ہوا، اسلام نے جنت اور دوزخ کا جو تصور پیش کیا ہے اسے حیوانی کہنا ہرگز درست نہیں۔ انشاءاللہ آئندہ صفحات میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا جائے گا۔ (پیام)

اعلیٰ ترین نعمت جمال الٰہی کا دیدار ہو گا جو دوسری تمام نعمتوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ و افضل مرتبے کا حامل ہے۔ حضرت محمد ﷺ فرماتے ہیں کہ "جنت میں تمہیں سلامتی حاصل ہو گی" اور ------ یہی سلامتی تو وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کے حصول کے لئے ہر صاحب بصیرت انسان اس دنیا میں شب و روز سرگرداں و کوشاں ہے، آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ:۔

> "تم جنت میں چھپر کھٹوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھو گے اور تمام بغض و عداوت تمہارے سینوں سے نکال کر پھینکے جائیں گے، تم نہایت گرم جوشی سے ایک دوسرے سے محبت کرو گے، ایک دوسرے کو آنکھوں میں جگہ دو گے اور اس جنت سے لطف و سرور حاصل کرو گے"۔ (۲)

جنت کے حیوانی لذائذ اور حضرت محمد ﷺ پر ہوس پرستیوں کے بارے میں جو (غلط) اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے مجھے بہت سے امور کا ذکر کرنا چاہئے تھا لیکن ان کو بیان کرنے میں بہت سی قباحتیں ہیں اس لئے میں صرف دو باتیں بیان کرتا ہوں، فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔

گوئٹے کا اسلامی نظریہ

ان دو باتوں میں سے پہلی بات کی طرف تو جرمنی کے ممتاز دانشور "گوئٹے" کی کتاب "MEISTER'S TRAWELS" نے میرے ذہن کو متوجہ کیا۔ گوئٹے اپنے ہیرو کو ایک ایسی انجمن میں لے جاتا ہے جس کے اراکین نے بعض بڑے عجیب اصول اختیار کر لئے تھے، مثال کے طور پر انجمن کا صدر اپنے اراکین سے

---

(۲) یہ رسول اقدس ﷺ کا ارشاد نہیں بلکہ قرآن کریم کے ارشادات کا خلاصہ ہے۔ (پیام)

مطالبہ کرتا ہے کہ آپ لوگ اپنی کسی ایک (جائز) خواہش کو ترک کر دیں، یعنی آپ میں سے ہر شخص کو اتنی قدرت حاصل ہو جائے کہ اس کا دل جس (جائز) چیز یا جس (جائز) کام کو چاہے وہ اس کے برعکس خود کو ایسا کام کرنے پر آمادہ کرے جسے اس کی طبیعت ناپسند کرتی ہو۔ اس کے بدلے میں ہم اسے اجازت دیدیں گے کہ وہ اپنی (جائز) خواہشات کے دائرے کو پہلے سے بھی زیادہ وسعت دے لے اور آزادی کے ساتھ انہیں پورا کرے۔ (3)

(سچی بات یہ ہے کہ "گوئٹے" کا مقرر کردہ) یہ اصول مجھے بہت بھلا لگا۔ اچھی چیزوں سے لطف حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ بری بات نہیں، مضائقہ اور برائی اس میں ہے کہ انسان نفس کا غلام بن کر رہ جائے اور خود کو خواہشات کا تابع کر لے۔ اسے اپنے نفس کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ اسے اپنی خواہشات پر قابو حاصل ہو چکا ہے؟ وہ اپنی عادتوں کا غلام تو نہیں، اگر کسی وجہ سے اپنی کوئی عادت اسے ترک کرنی پڑے تو کیا وہ اسے با آسانی ترک کر سکتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی قابل قدر اصول ہے (جو انسان کی سیرت و کردار میں انقلاب عظیم پیدا کر سکتا ہے)۔

رمضان کیا ہے؟ جسے اسلامی تعلیمات اور خود رسول اقدس ﷺ کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی، ترک خواہشات کے اس اصول ہی کی طرف تو مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے (جو جرمن فلسفی گوئٹے نے بعد میں اپنایا) اگر کوئی کہتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا اس سے مدعا صاف اور واضح طور پر تہذیب نفس اور تربیت اخلاق نہ تھا تو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسی نوعیت کا کوئی اعلیٰ وارفع مقصد ضرور

---

(3) HEROES AND HERO-WORSHIP, P-308 (DENT:LONDON)

آپ ﷺ کے پیش نظر تھا جس کی ہمیں داد دینی پڑے گی۔

حضور اقدس ﷺ کا نظریہ کہ اعمال کا اثر روح پر پڑتا ہے

اسلام نے جنت اور جہنم کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے بارے میں ہمیں یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھنی چاہئے کہ (ہم اہل مغرب کے نقطۂ نگاہ سے) اسے کتنا ہی غیر لطیف قرار دیا جائے اس کے باوجود اسلامی جنت اور دوزخ کا تصور حقیقت سرمدی کی ایک ایسی تصویر ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ عیش و عشرت سے معمور جنت، آگ دہکاتی ہوئی شعلہ زن دوزخ اور یوم حشر کے آہن گداز مصائب جن کا حضرت محمد ﷺ نے بار بار ذکر فرمایا ہے، آپ جانتے ہیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ دراصل یہ سب ایک ہلکا سا پرتو ہے اس عظیم تر حقیقت روحانی کا جسے تمام حقائق ابدی کی ابتدا کہنا غلط نہ ہو گا۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے لاعلمی اور محرومی ہم سب کے لئے سخت نقصان کا موجب ہو گی۔ ان میں سب سے بڑی اور بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اعمال (ہماری روح پر) ایک دائمی اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ یعنی انسان سے اس دنیائے فانی میں جو افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ بے نتیجہ نہیں رہ سکتے اگر وہ اچھے اعمال سرانجام دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ جنت کا سزاوار ہو جاتا ہے اور ناپسندیدہ اور قبیح اعمال کے نتیجے میں جہنم اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ جنت کی بلندی اور جہنم کی پستی یہ سب کچھ وہ اپنے اعمال کی صورت میں اپنے ساتھ رکھتا ہے گویا اس کی عمر کے ساٹھ سال جو بظاہر ایک قلیل سی مدت ہے اپنے اندر بڑی وسعت رکھتے ہیں جن کی شاید کوئی حد ہی نہ ہو۔

”عالم روحانیت کے یہ رازہائے سربستہ اس عربی روح کی لوح پاک پر حروف آتشیں سے ثبت تھے، شعلہ و برق کے رسم الخط میں کندہ تھے۔“ (۴) یہ حقائق ہمہ وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتے تھے۔ وہ انہیں پوری صداقت اور حد درجہ خلوص کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ (۵) ان حقائق کو حضرت محمد ﷺ الفاظ کا لباس بخش کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور جنت و جہنم کے ناموں سے متعارف کراتے ہیں یعنی آپ ﷺ یہ حقیقت ہمارے دل میں اتارنا چاہتے ہیں کہ انسان کے اعمال اس کی روح پر اپنے اثرات ضرور چھوڑ جاتے ہیں جو بعد میں جنت اور جہنم کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے تمام حقیقتوں کا نقطۂ آغاز کہنا چاہئے، اسے خواہ کسی بھی تمثیل کی صورت میں بیان کیا جائے، کسی بھی پیرایہ اظہار میں شامل کیا جائے حد درجہ محترم ہے۔

حضورؐ اقدس کے نزدیک مقصد حیات

ایک بڑا سوال یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کس مقصد کی خاطر بھیجا گیا ہے؟

---

(۴) کارلائل کے لیکچر کے اس خوبصورت ترین جملے کا ترجمہ پروفیسر مہدی حسین ناصری مرحوم نے اپنی کتاب ”سرورؐ انبیا“ میں یوں کیا ہے ---- ”یہ خیالات اس عربی روح میں مشتعل اور شعلہ زن ہیں، شعلے یا برق سے گویا یہ امور لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔“
پروفیسر اعظم خاں نے اپنی کتاب ”سیدؐ الانبیا“ میں اس فقرے کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ---- ”یہ تمام امور اس ناتراشیدہ عربی روح پر حروف آتشیں سے کندہ تھے، شعلہ و برق سے لکھے تھے۔“
ہم نے اس فقرے کو ان الفاظ کا لباس پہنایا ہے کہ ---- عالم روحانیت کے یہ رازہائے سربستہ اس عربی روح کی لوح پاک پر حروف آتشیں سے ثبت تھے، شعلہ و برق کے رسم الخط میں کندہ تھے۔“ (پیام)

(۵) یہاں کارلائل مغرب کے دو بڑے مسیحی دانشوروں کا ذکر کرتا ہے ایک ”جرمی بینتھم“ اور دوسرا ”ولیم پالے“ جو اپنے دور کے بہت بڑے فلسفی، قانون داں اور ماہر دینیات تھے۔ (پیام)

اس کی پیدائش کی غایت کیا ہے؟ کارلائل کہتا ہے کہ "حضرت محمد ﷺ نے اس سوال کا ایسا بھرپور اور کافی و شافی جواب دیا ہے جس کے سامنے بڑے سے بڑے مسیحی عالم کی موشگافیاں اور خشک منطق ہیچ ہے۔ آپ ﷺ مسیحی علما کی طرح گناہ اور ثواب کو سامنے رکھ کر یہ نہیں دکھاتے کہ ان کے نتیجے میں کیا کھویا اور کیا پایا' نہ کفروایمان کو جمع اور تفریق کے ترازو میں تول کر اعمال کا منافع دکھاتے ہیں (کیونکہ دریافت طلب اس صورت میں اعمال کی اچھائی اور برائی میکانکی بن کر رہ جاتی ہے) جبکہ گناہ اور ثواب میں صرف یہ فرق نہیں کہ ایک اچھا اور دوسرا برا ہے بلکہ ان میں وہ فرق ہے جو موت اور حیات میں ہوتا ہے' جو بہشت اور جہنم میں ہوتا ہے۔ گناہ' گناہ ہے جس کا ارتکاب کسی صورت میں نہیں ہونا چاہئے اس کا نتیجہ خواہ جنت ہو یا جہنم۔ اسی طرح ثواب اور نیکی کا کام ہر صورت میں کرنا چاہئے' اس کا نتیجہ خواہ اچھا ہو یا برا اس کے عوض جنت ملے یا جہنم۔ گناہ اور ثواب کا وزن نہیں کیا جا سکتا' ان کے ناپنے کا کوئی پیمانہ آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ گناہ انسان کے لئے ابدی موت اور ثواب اس کے لئے ابدی زندگی ہے۔ مسیحی مصلح "بینتھم" (BENTHAM) اعمال کے نفع و نقصان کا جو نظریہ ہمیں دیتا ہے وہ تو نہایت غلط ہے یعنی نیکی صرف اس لئے کرنا کہ اس کے صلے میں فائدہ ہوتا ہے اور بدی سے اس لئے دست کش رہنا کہ اس کے ارتکاب کے نتیجے میں نقصان ہوتا ہے ----- یہ تو اس کائنات کو' اس عالم انسانیت کو ایک جامد آلہ بنا دینے کے مترادف ہے' یہ تو عظیم روح انسانی کو اس کی علوی صفات سے محروم کرکے اسے صرف خوشی اور غم کا پیمانہ بنا دینے والی بات ہے۔ اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ انسان اور انسانیت کے اختتام و انجام کا ایک ناقص اور گھٹیا نظریہ حضرت محمد ﷺ نے پیش کیا یا ان مسیحی علما اور دانشوروں نے؟ تو میرا جواب یہ ہوگا کہ ان مسیحی علما اور دانشوروں نے!

ہم ایک بار پھر اپنی بات کا اعادہ کریں گے کہ اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اسلام عیسائیت ہی کی ایک شکل ہے۔ اسلام میں عیسائیت کے وہ تمام اعلیٰ روحانی عناصر پائے جاتے ہیں جن سے اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود عیسائیت عبارت ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے جنت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اطاعت الٰہی اور پاکیزہ زندگی گذارنے کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ اسے حاصل کرنے اور اس میں داخل ہونے کے لئے اعلیٰ درجے کے اعمال کے علاوہ ایک طویل اور صبر آزما استقامت کی ضرورت ہے جو کہیں زیادہ امر دشوار ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے مذاہب قدیم کے عقائد میں ایک عنصر صادق کا اضافہ کر دیا۔ (٦) اس روحانی عنصر کو جھوٹا عقیدہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا (اگر ہمارے یعنی مسیحیوں کے نزدیک کسی اسلامی عقیدے میں کوئی خامی ہے بھی تو بھی ان کوتاہیوں پر حرف گیری کرنے کی بجائے) ہمیں اسلام کی صداقتوں کو دیکھنا چاہئے۔

اسلام کی غیر معمولی ہردلعزیزی

بارہ سو سال (۱۸۴۰ء تک) گذر جانے کے باوجود اسلام آج بھی ساری دنیا کی آبادی کے پانچویں حصے کا مقبول ترین مذہب بنا ہوا ہے' ایسا مذہب جو اس کے ماننے والوں کا مقصد حیات بھی ہے۔ قابل ذکر اور اہم ترین بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے

---

(٦) یہاں کارلائل اپنے اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے جس جنت کا تصور پیش کیا ہے وہ اسکنڈے نیوین عقیدہ ہے جسے آپ ﷺ نے وسعت دے کر جنت کی صورت میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے زمانے کے عربوں نے تو شاید اسکنڈے نیویا کا نام تک نہ سنا ہو۔ حضور اقدس ﷺ نے خود تو کسی جنت یا دوزخ کا تصور پیش نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے تو وہی فرمایا جو آپ ﷺ کو جناب الٰہی سے وحی کیا گیا۔ (پیام)

اسے قبول کیا ہے وہ اس کی صداقت پر یقین محکم رکھتے ہیں، وہ دل کی گہرائیوں سے اسے دین صادق سمجھتے ہیں۔ عرب لوگ اسلام پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں اور وہ اس پر عمل کرنے کے بھی آرزومند ہیں۔ مسیحیت کے آغاز سے لے کر آج تک شاید ہی کوئی ایسا مسیحی فرقہ ہو جو اپنے مذہب پر اتنا اعتقاد رکھتا اور اس کی اتنی پابندی کرتا ہو جتنی مسلمان کرتے ہیں (۷) اور اس پر بصدق دل سے یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ اسے صرف اپنی عقبیٰ ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی دنیا کی فلاح کے لئے بھی بنیاد سمجھتے ہیں۔

آج کی شب قاہرہ کی سڑکوں پر گشت کرنے والا سرکاری محافظ جب کسی راہ گیر کی آہٹ پاکر آواز دے گا کہ "کون جا رہا ہے؟" تو اس کے جواب میں راہ گیر اپنا نام اور پتا بتانے کے علاوہ یہ اعلان بھی کرے گا (کارلائل کے الفاظ میں) کہ:۔

"THERE IS NO GOD BUT GOD"(8)

(اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ یعنی "لا الٰہ الا اللہ)

(گویا اپنے مسلمان ہونے کی شناخت کرائے گا)

"اللہ اکبر" ----- اور "اسلام" ----- یہ وہ الفاظ ہیں جو کروڑوں انسانوں کی رگ رگ میں جذب ہو کر ان کی زندگی کا ایسا جزو بن چکے ہیں جنہیں ان کے وجود بلکہ روح سے جدا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس عقیدے پر کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں مسلمان اپنے روزانہ کے معمولات زندگی کی طرح عمل کرتے ہیں اور اسلام کے سرگرم مبلغ اپنے مذہب کی اشاعت میں مصروف رہتے ہیں چنانچہ ملائشیا کے غیر مسلم، مختلف ممالک کے سیاہ فام باشندے اور بت پرست اقوام انہی مبلغوں کی پرجوش تبلیغ کے نتیجے میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں اور وہ مذاہب جو اپنے مرتبے کے اعتبار سے اسلام سے کسی طور بہتر نہیں تھے اسلام سے مغلوب ہو گئے۔

حضور اقدس ﷺ، اسلام اور عرب

عربوں کے لئے تو اسلام ظلمت میں نور بن کر ظاہر ہوا اور عرب قوم کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہوئی۔ غریب چرواہوں کی ایک قوم جو اپنی تاریخ کے آغاز سے گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی اور ریگ زاروں میں بھٹکتی پھر رہی تھی، وہ ایک نابغہ روزگار پیغمبرِ عظیم ﷺ کے ہاتھوں ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گئی جو ان کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا گیا تھا ----- دیکھو! عرب کے وہ غریب شتربان جن کا دنیا میں کوئی نام بھی نہ جانتا تھا، نہ صرف ساری دنیا میں مشہور ہو گئے بلکہ اکناف عالم پر چھا گئے۔ ابھی ایک صدی ختم نہیں ہوئی تھی کہ غرناطہ سے دہلی تک عربوں کا سکہ چلنے لگا، ان کی ذہانت و فطانت اور جرات و شجاعت نے دنیا کے بہت بڑے حصے کو مدت دراز تک اپنی آغوش میں لئے رکھا۔ بلاشبہ ایمان بہت بڑی اور جاں پرور نعمت ہے، جب یہ نعمت کسی قوم کو حاصل ہو جاتی ہے تو اس کی تاریخ عظمت کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے اور اس کی داستان عظمت تاریخ کے آسمان پر خورشید عالم تاب بن کر جگمگانے لگتی ہے۔ (اور یہی اسلام کے ساتھ ہوا، دیکھو-----) قومِ عرب ----- مردِ عظیم حضرت محمد ﷺ-----؟ اور ایک صدی کی مدت-----؟ ان سب چیزوں کو سامنے رکھو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک معمولی سی چنگاری خاک کے ایک ڈھیر پر آگری۔ یہ انبارِ خاک بظاہر آگ پکڑنے کی قطعاً" صلاحیت نہیں رکھتا تھا کیونکہ خاک کا ڈھیر تھا مگر دیکھو! آن واحد میں وہ خاک کا ڈھیر بارود میں تبدیل ہو گیا اور اس میں سے ایسے شعلے بلند ہوئے جنہوں نے دہلی سے لے کر غرناطہ تک ایک عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

---

(۷) منجملہ انگریزوں کے موجودہ فرقے "PURITANS" کے۔ (کارلائل)

(8) "HEROES AND HERO WORSHIP - P-310 DENT:LONDON (1964)

جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بڑا انسان (جیسے حضرت محمدؐ) مانندِ برق ہوتا ہے جو آسمان پر بجلی کی طرح کوند جاتا ہے ----- اور دوسرے لوگ خس و خاشاک کے انبار کی مانند ہوتے ہیں' وہ اس برق صاعقہ بار کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ آتا ہے اور چشم زدن میں انہیں اپنے نفس آتشیں سے شعلہ ء تاباں کر دیتا ہے۔ (جس طرح حضرت محمد ﷺ نے عربوں کی بے جان اور بے نام و نشاں قوم کو زندگی کی حرارت بخش کر اقوام عالم کا رہنما اور نجات دہندہ بنا دیا)

حصّہ دوم

(کارلائل کے اعتراضات کے جواب)

(پیام)

وضاحت

ہمارا ایمان ہے کہ توریت، زبور اور انجیل اللہ تعالیٰ کے مقدس انبیاء پر نازل ہوئی تھیں۔ بلاشبہ یہ آسمانی صحائف تھے مگر بعد کو ان میں تغیر و تبدل کر دیا گیا۔

آئندہ صفحات میں ہم نے اسی تحریف شدہ بائیبل پر تنقید کی ہے، ورنہ اصل بائیبل ہمارے نزدیک نہایت مقدس و محترم کتاب تھی جس پر ایمان لانے کا قرآن شریف ہمیں حکم دیتا ہے۔

اسی طرح ہم اپنے مسیحی بھائیوں کا دل سے احترام کرتے ہیں، نہ صرف مسیحی بھائیوں کا بلکہ ہر مذہب و مسلک کے لوگوں سے محبت کرنا ہمارا مسلک ہے۔ مگر FACTS ARE FACTS. حقائق کا انکار گناہ ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم نے حقائق بیان کئے ہیں۔ ع

"مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں "ہمیں"

(مولف)

اسلام اور مسیحیت

"اسلام عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔
اگر عیسائیت نہ ہوتی تو اسلام بھی نہ
ہوتا"۔ (کارلائل)

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس قدر بھرپور خراج تحسین پیش کرنے کے باوجود کارلائل اسلام اور قرآن دونوں کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکا اور اس نے اسلام کو عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیدیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے سامنے حضور اقدس ﷺ کے بارے میں مخالفانہ لٹریچر کا انبار لگا ہوا تھا جو گذشتہ سینکڑوں سال میں یورپ کے متعصب پادریوں اور ان سے متاثر ہونے والے مسیحی مصنفوں نے تخلیق کیا تھا۔ دوسری طرف کسی مسلمان عالم دین کا ترجمہ کیا ہوا قرآن اس کے سامنے موجود نہ تھا اس نے قرآن حکیم کے جس نسخے سے استفادہ کیا وہ "جارج سیل" کا ترجمہ تھا جو ۱۷۳۴ء میں شائع ہو چکا تھا (یعنی کارلائل کے لیکچر کی تیاری سے قریباً ایک صدی قبل) جارج سیل نے قرآن حکیم کا ترجمہ کرتے ہوئے جو غلطیاں کیں کارلائل ان سے ناواقف رہا اور بے خبری میں انہیں قبول کر لیا۔ اس طرح وہ بعض مقامات پر ٹھوکر کھا گیا۔

ان مقامات میں سے سب سے زیادہ توجہ طلب وہ مقام ہے جہاں کارلائل عیسائیت کو اسلام سے بہتر مذہب قرار دیتا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسلام کو عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل ٹھہراتا ہے، مگر اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایک بھی

دلیل پیش نہیں کرتا۔ یہ نہ صرف اسلام کی حقانیت سے ناواقفیت ہے بلکہ حقائق کے بھی سراسر خلاف دعویٰ ہے۔ اگر ہم اس مقام سے خاموشی کے ساتھ گذر جائیں گے اور کارلائل اور ان کے ہم خیال مسیحی مفکروں کے اس اعتراض کا جواب نہیں دیں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ مترجم کی حیثیت سے ہم نے کارلائل کے ان خیالات سے بھی اتفاق کر لیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کے ہزاروں لاکھوں قارئین گمراہ ہو جائیں گے اس لئے اس باب میں ہم دونوں مذاہب کا تقابلی جائزہ پیش کریں گے۔ پڑھنے والے خود نتیجہ نکال لیں گے کہ ان دونوں میں سے کون سا مذہب افضل و برتر ہے۔ اگر کارلائل اور اس کے پیش رو مسیحی مصنفین یہ اعتراض نہ کرتے تو ہمیں بھی یہ ناخوشگوار فرض ادا نہ کرنا پڑتا۔

فضیلت کا پیمانہ

آیئے دیکھیں کہ اسلام اور مسیحیت دونوں میں سے عالم گیر مذہب کون سا ہے؟ فضیلت اور برتری جانچنے کا یہی اصل پیمانہ ہے۔

تاریخ کہتی ہے کہ سیدنا حضرت مسیحؑ ابن مریمؑ ایک مخصوص قوم کی اصلاح کے لئے مبعوث کئے گئے تھے۔ آپؑ کے مخاطب صرف بنی اسرائیل تھے جیسا کہ آپ خود بھی فرماتے ہیں:۔

> "میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور
> کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔(۱)

یعنی میں صرف اور صرف اپنی قوم بنی اسرائیلؑ کا نبی ہوں ان کے علاوہ اور کوئی قوم میری مخاطب نہیں۔ چنانچہ جب آپؑ نے اپنے بارہ حواریوں کو تبلیغی

---

(۱) متی کی انجیل باب ۱۵۔ آیت ۲۴

مشن پر روانہ کیا تو ہدایت فرمائی کہ:۔

> "غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں
> داخل نہ ہونا ○ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی
> بھیڑوں کے پاس جانا○" (۲)

پھر جب کنعانی قوم کی ایک عورت نے حضرت مسیحؑ سے اپنی بیمار بیٹی کے علاج کی التجا کی تو آپؑ نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا کہ:۔

> "لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں"○(۳)

اگر انجیل کی یہ روایت درست ہے تو گویا حضرت مسیحؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) کے لوگوں کو تو اپنے بیٹے اور غیر اقوام کے لوگوں کو کتے ٹھہرایا۔ اس طرح خود حضرت مسیحؑ کے ارشاد کی روشنی میں ثابت ہو گیا کہ آپؑ کی تعلیم اور آپؑ کی شریعت صرف اور صرف اسرائیلیوں کے لئے تھی، غیر اسرائیلی ہرگز آپؑ کے مخاطب نہ تھے۔

دوسری طرف آنحضرت ﷺ پر جو دین نازل ہوا اس کے مخاطب کسی ایک قوم، کسی ایک ملک یا کسی ایک طبقے کے لوگ نہیں تھے بلکہ یہ دین اور شریعت ساری دنیا کے لئے تھی۔ قرآن کے مخاطب روئے زمین پر پائے جانے والے تمام انسان تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے رسول:۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الخ

(الاعراف-۱۵۸)

---

(۲) متی کی انجیل باب ۱۰۔ آیت ۶

(۳) متی کی انجیل باب ۱۵۔ آیت ۲۶

کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب انسانوں کی طرف خدا کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ سے یہ نہیں فرمایا کہ مکہ والوں سے کہہ دیجئے یا عربوں سے کہہ دیجئے بلکہ فرمایا کہ تمام دنیا کے انسانوں کو مخاطب کر کے کہہ دیجئے:
اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا! (سب لوگوں کی طرف!)

آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ پر نازل ہونے والے دین کے دائرہ کار کی مزید تشریح کر دی چنانچہ فرمایا:۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ الخ (سبا آیت ۲۸)
(اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف (بشیر و نذیر) بنا کر بھیجا ہے)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:۔

وَاَرۡسَلۡنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ط (النساء آیت ۷۹)
(اور ہم نے آپ کو تمام بنی نوع انسان کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے)

یعنی دنیا کے جس خطے میں بھی انسان آباد ہیں وہ سب آنحضرت ﷺ کے مخاطب ہیں اور آپ ﷺ ان سب کی اصلاح اور فیض رسانی کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں۔

اور آخر میں قرآن حکیم کا وہ ارشاد جس نے پوری وضاحت سے آنحضرت ﷺ کے مقام کی تشریح فرما دی چنانچہ ارشاد ہوا کہ:۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (الانبیاء آیت ۱۰۷)
(اور ہم نے صرف ایک ملک یا ایک زمانے کے لئے نہیں بلکہ آپ ﷺ کو سارے زمانوں اور سارے ممالک کی طرف رسول رحمت بنا کر بھیجا ہے)

اس قسم کا کوئی دعویٰ نہ صرف حضرت مسیحؑ نے نہیں کیا بلکہ دنیا کے کسی پیغمبر نے نہیں کیا۔ تمام پیغمبر صرف اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے۔ یہ شرف و فضیلت صرف اور صرف حضور اقدس ﷺ کو حاصل ہے کہ آپ ﷺ دنیا کے ہر حصے میں پائے جانے والے انسانوں کے لئے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے اور قیامت تک کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ پر جو شریعت نازل کی گئی وہ دنیا کے تمام انبیا پر نازل ہونے والی شریعتوں سے کہیں زیادہ مکمل اور جامع ہے کیونکہ اس میں قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے جبکہ حضرت مسیحؑ پر نازل ہونے والی شریعت صرف آپؑ کی قوم (بنی اسرائیل) کے لئے تھی۔

پس کارلائل کا یہ کہنا کہ عیسائیت اسلام سے بہتر دین ہے غلط اور بے بنیاد دعویٰ ہے کیونکہ جو دین اور جو شریعت صرف ایک قوم کی ضروریات کے مطابق ہو گی وہ یقیناً محدود ہو گی اور صرف اسی قوم کی ضروریات کی کفالت کر سکے گی جس کے لئے اسے نازل کیا گیا۔ اس کے بر عکس جو شریعت ساری دنیا میں پائے جانے والے تمام انسانوں کے لئے نازل کی جائے گی وہ مکمل اور جامع ترین شریعت ہو گی کیونکہ اس میں ہر قوم اور ہر زمانے کے لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہو گیا۔ چونکہ مسیحیت خود حضرت مسیحؑ کے ارشاد کے مطابق صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی اور صرف وہی اس کے مخاطب تھے اس لئے اس کی تعلیم محدود ہے جبکہ اسلام تمام دنیا کے لئے ہے اور رسول کریم ﷺ کو سارے بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کیا گیا اس لئے ازروئے منطق بھی آپ ﷺ پر نازل ہونے والی تعلیم مسیحیت سے کہیں زیادہ افضل، مکمل اور جامع ثابت ہوتی ہے۔ اب اس کی کچھ مثالیں:

حضرت مسیحؑ کا باپ؟

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انجیل خدا کا کلام تھا' یعنی خدا کی طرف سے ان کے دل میں ڈالا گیا۔ اس میں ذرا سا شک کرنا بھی گناہ ہے کہ حضرت مسیحؑ خدا کے سچے اور مقدس پیغمبر تھے اور آپؑ پر نازل ہونے والا دین سچا دین تھا مگر حضرت مسیحؑ کی تعلیمات، جس رنگ میں ہم تک پہنچی ہیں اسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں واضح تضادات پیدا ہو گئے۔ مثال کے طور پر موجودہ انجیلیں حضرت مسیحؑ کے نسب نامے ہی کو مشکوک بنا دیتی ہیں۔ ایک انجیل کہتی ہے کہ:

"حضرت مسیحؑ جناب یوسف کے بیٹے تھے اور جناب یوسف یعقوب کے بیٹے تھے" (۴)

یعنی حضرت مسیحؑ کے دادا کا نام یعقوب تھا۔ دوسری انجیل کا بیان ہے کہ:۔

حضرت مسیحؑ کے دادا کا نام (یعقوب نہیں بلکہ) عیلی تھا۔ (۵)

جہاں تک حضرت مسیحؑ کے بن باپ پیدا ہونے کا تعلق ہے تو اس میں بھی انجیل کے بیانات بہت ہی متضاد ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا حضرت مسیحؑ کے زمانے میں بچہ بچہ جانتا تھا کہ آپؑ بن باپ پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ آپؑ کا باپ موجود تھا اور وہ جناب یوسف نجار تھے۔ چنانچہ انجیل بیان کرتی ہے کہ جب حضرت مسیحؑ (تبلیغی دورے پر) اپنے وطن ناصرہ تشریف لائے اور سبت کے دن عبادت خانے میں گئے تو آپؑ نے یسعیاہؑ نبی کی کتاب کھول کر پڑھنی شروع کی اور اس

---

(۴) متی کی انجیل باب ۱۔ آیت ۱۵ تا ۱۷

(۵) لوقا کی انجیل باب ۳۔ آیت ۲۳

کتاب مقدس کے حوالوں سے ثابت کیا کہ یسعیاہ نبی نے جس مسیحؑ کی آمد کی بشارت دی تھی وہ میں ہی ہوں۔ اس کے بعد:۔

"وہ کتاب بند کر کے اور خادم کو واپس دے کر بیٹھ گیا اور جتنے عبادت خانہ میں تھے سب کی آنکھیں اس پر لگی تھیں ○ وہ ان سے کہنے لگا کہ آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا ○ اور سب نے اس پر گواہی دی اور ان پُر فضل باتوں پر جو اس کے منہ سے نکلتی تھیں تعجب کر کے کہنے لگے کہ "کیا یہ یوسف کا بیٹا نہیں"۔ (۶)

یہاں بھی عبادت خانے میں موجود یہودی حضرت مسیحؑ کو جناب یوسف نجار کا بیٹا کہتے ہیں کیونکہ انجیل کی رو سے حضرت مسیحؑ کے وطن ناصرہ کے لوگ جانتے تھے کہ آپؑ بغیر باپ پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ آپؑ کا باپ تھا اور وہ زندہ موجود تھا۔ وہ بڑے تعجب سے کہتے تھے کہ یہ تو یوسف نامی ایک ترکھان کا بیٹا ہے جسے ہم خوب جانتے ہیں یہ کیسے مسیحؑ ہو سکتا ہے۔ بھلا ترکھان (بڑھئی) کا بیٹا بھی مسیحؑ ہو سکتا ہے؟ ذرا اور آگے بڑھیں تو ہمیں یوحنا کی انجیل میں بھی اسی قسم کا ایک بیان ملتا ہے جس میں پھرپوری صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ جناب یوسف کے فرزند تھے چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے ایک شاگرد فلپس نے اپنے ایک دوست "نتن ایل" سے کہا کہ:۔

"جس کا ذکر موسیٰؑ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے ○ (۷)

---

(۶) لوقا کی انجیل باب ۴۔ آیت ۲۲

(۷) یوحنا کی انجیل باب ۱۔ آیت ۴۵

گویا حضرت مسیحؑ کے شاگردانِ خاص اور حواری بھی جانتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ حضرت مسیحؑ بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ آپؑ کا باپ موجود تھا اور وہ جناب یوسف نجار تھے۔

اسی "یوحنا" میں ایک اور مقام پر پھر صراحت کی گئی ہے کہ جناب مسیحؑ بن باپ پیدا نہیں ہوئے تھے اس روایت میں آپؑ کی ماں اور باپ دونوں کا ذکر کیا گیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ ایک روز حضرت مسیحؑ نے یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

> "زندگی کی روٹی میں ہوں۔ جو میرے پاس آئے وہ ہرگز بھوکا نہ ہو گا اور جو مجھ پر ایمان لائے وہ کبھی پیاسا نہ ہو گا.... اس پر یہودی بڑبڑانے لگے۔ اس لئے کہ اس نے کہا تھا کہ جو روٹی آسمان سے اتری وہ میں ہوں ○ اور انہوں نے کہا کہ کیا یہ یوسف کا بیٹا یسوع نہیں جس کے باپ اور ماں کو ہم جانتے ہیں؟ اب یہ کیونکر کہتا ہے کہ میں آسمان سے اترا ہوں ○(۸)

گویا حضرت مسیحؑ کے اہل وطن جن میں یہودی اور مسیحی دونوں شامل تھے خوب جانتے تھے کہ آپؑ بغیر باپ پیدا نہیں ہوئے وہ آپؑ کے ماں اور باپ دونوں سے واقف تھے۔ انجیل کی اس روایت کی رو سے اگر جناب مسیحؑ بغیر باپ پیدا ہوئے ہوتے تو یہودی اور آپؑ کے شاگردانِ خاص کبھی اس کا انکار نہ کرتے اور یہودی تو بطور طنز اور بطور اعتراض کہتے کہ اس کا تو باپ ہی نہیں یہ پیغمبر کیسے ہو گیا؟ مگر اس کے برعکس انجیل کہتی ہے کہ وہ آپؑ کے ماں اور باپ دونوں کی موجودگی کے قائل ہیں۔

دوسری طرف اسی انجیل میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ آپؑ بغیر باپ پیدا

---

(۸) یوحنا کی انجیل باب ۶۔ آیت ۳۵، ۴۱

ہوئے اور بہت معتبر راوی نے بیان کیا ہے جس میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں چنانچہ لکھا ہے کہ:۔

> "اب یسوع مسیحؑ کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی ○ پس اس کے شوہر یوسف نے جو راستباز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا اسے چپکے سے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا ○ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا اے یوسف ابن داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے ○ اس کے بیٹا ہو گا اور تو اس کا نام یسوع رکھنا..... پس یوسف نے نیند سے جاگ کر ویسا ہی کیا جیسا خداوند کے فرشتے نے اسے حکم دیا تھا اور اپنی بیوی کو اپنے ہاں لے آیا ○ اور اس کو نہ جانا (۹) جب تک اس کے بیٹا نہ ہوا اور اس کا نام یسوع رکھا ○

انجیل کی دوسری روایات کے برعکس جس میں حضرت مسیحؑ کو یوسف نجار کا بیٹا کہا گیا ہے اس روایت میں بہت ہی صراحت سے آپؑ کو بن باپ کہا گیا ہے۔ ان تمام روایتوں کو سامنے رکھ کر ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں باہم بہت تضاد ہے اور

---

(۹) متی کی انجیل باب ۱۔ آیت ۱۸

"نہ جانا" سے مراد یہ تھی کہ جنسی تعلق قائم نہیں کیا۔ چنانچہ انگریزی انجیل میں پوری وضاحت کر دی گئی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ: (باقی اگلے صفحہ کے حاشیے پر)

پڑھنے والا بری طرح کنفیوز ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی روایت درست ہے اور اصل معاملہ کیا ہے؟ آیا آپؑ بغیر باپ پیدا ہوئے تھے یا آپؑ کا کوئی باپ تھا؟

یہ تضاد انجیل کا ہرگز نہیں کیونکہ وہ تو خداوند قدوس کا مقدس کلام تھا اور خدا کے کلام میں تضاد نہیں ہوتا۔ یہ تضاد بعد کے انجیل نویسوں نے پیدا کیا۔ اس طرح گویا موجودہ انجیل تو اپنے مقدس پیغمبر کی ولادت کی حقیقت کے بارے میں بھی کوئی واضح اور قطعی بات نہیں کہتی بلکہ خود بھی الجھن میں گرفتار ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی الجھا دیتی ہے۔ ایسی کتاب پر مبنی مذہب کو اسلام سے بہتر کیسے قرار دیا جا سکتا ہے یہ کارلائل کی بھول تھی۔

قرآن کریم میں ولادت مسیحؑ کا بیان

انجیل کے برعکس قرآن کریم میں حضرت مسیحؑ کی ولادت کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ نہایت غیر مبہم اور واضح ہے۔ اس میں تضاد نام کو نہیں۔ یہ واقعہ قرآن حکیم میں چار مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر سورہ آل عمران میں اور تین مقامات پر سورۂ مریم میں۔ ان چاروں مقامات پر بیان کردہ واقعات آپس میں نہایت درجہ مربوط ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

(: پچھلے صفحہ کا بقیہ)

HE TOOK HIS WIFE HOME, BUT HE DID NOT LIVE WITH HER AS A HUSBAND TILL SHE BORE A SON, WHOME HE CALLED JESUS." (MATTHEW. 1-24)

(یعنی وہ (یوسف نجار) اپنی بیوی (حضرت مریمؑ) کو گھر لے آئے مگر ان کے ساتھ اس وقت تک شوہر کی حیثیت سے زندگی نہیں گذاری جب تک ان کے بیٹا پیدا نہیں ہو گیا اور اس کا نام یسوع رکھا۔)

اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ الخ (آل عمران آیت ۴۵)

ترجمہ:۔ یاد کرو جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم اللہ تعالیٰ آپ کو ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کی جانب سے ہوگا' اس کا نام مسیحؑ عیسیٰ ابن مریم ہوگا' جو دنیا اور آخرت دونوں میں صاحب منزلت اور مقربین الٰہی میں سے ہوگا اور پنگھوڑے میں (یعنی چھوٹی عمر میں) بھی لوگوں سے (پر حکمت) کلام کرے گا اور ادھیڑ عمر میں بھی۔ اور نیکوکاروں میں سے ہوگا)

جب حضرت مریمؑ کو یہ بشارت دی گئی تو قرآن کہتا ہے کہ اسے سن کر آپؑ نے عرض کیا کہ:

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ ؕ (آل عمران آیت ۴۷)

ترجمہ:۔ انہوں نے کہا اے میرے پروردگار میرے ہاں بیٹا کس طرح پیدا ہوگا مجھے تو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا)

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کذالک" یعنی تم نے درست کہا ایسا ہی ہے (اگرچہ تمہیں کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا) مگر اللہ تعالیٰ جو چاہے پیدا کر سکتا ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے بارے میں (اتنا) کہہ دیتا ہے کہ "ہو جا" پس وہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا مقام قرآن شریف کا وہ ہے جہاں ایک بار پھر حضرت مسیحؑ کی ولادت کا

ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

واذکرنی الکتب مَرَیَم الخ (سورہ مریم آیت ۱۶)

(یعنی اے نبی ﷺ) ”آپ اس کتاب میں مریم کا بھی ذکر کیجئے جب وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر مشرق کی جانب ایک مکان میں چلی گئیں اور (مکان والوں سے خود کو چھپانے کی غرض سے ان کے اور اپنے درمیان) پردہ ڈال لیا پس اس حالت میں ہم نے ان کی طرف کلام لانے والا فرشتہ (جبرئیل) بھیجا جو ان کے سامنے ایک تندرست و توانا مرد کی صورت میں ظاہر ہوا وہ بولیں میں تجھ سے رحمان خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھ میں خدا کا خوف ہے (تو یہاں سے ہٹ جا) فرشتے نے کہا کہ میں آپ کے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں تاکہ آپ کو پاکیزہ بیٹا (یعنی اس کی بشارت) دوں وہ (تعجب سے) بولیں میرے بیٹا کیسے پیدا ہو گا حالانکہ مجھے تو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور میں بدکار بھی نہیں۔ فرشتے نے جواب دیا کہ ”کذالک“ اسی طرح ہے (یعنی آپ ٹھیک کہتی ہیں اور واقعی آپ کو کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ آپ بدکار ہیں لیکن) آپ کا رب فرماتا ہے یہ میرے لئے (کچھ مشکل نہیں بلکہ بہت) آسان ہے“۔ (کہ میں مرد کی شرکت کے بغیر کسی عورت کو بیٹا دیدوں)۔

اس کے بعد وہ مقام آتا ہے جب حضرت مریمؑ کے ہاں حضرت مسیحؑ پیدا ہو جاتے ہیں اور جب کچھ مدت کے بعد آپؑ انہیں لے کر اپنی قوم کی طرف واپس آتی ہیں تو لوگ زبان طعن دراز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:۔

یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ○ (سورہ مریم، آیت۔۲۷)

اے مریم! تو نے یہ بہت برا کام کیا (کیسے غضب کا کام کیا)
اے ہارون کی بہن! تیرا باپ تو برا آدمی نہیں تھا اور نہ تیری ماں
بدکار تھی (تو نے یہ کیا حرکت کی)

ترتیبِ واقعات

ولادت مسیحؑ کے جو واقعات قرآن حکیم نے بیان کئے ہیں وہ بہت ترتیب سے بیان ہوئے ہیں اور ان میں بڑا خوبصورت ربط ہے، کسی قسم کی الجھن، کوئی کنفیوژن نہیں، ان کی ترتیب اس طرح ہے۔

ایک پاکباز اور عفت مآب کنواری لڑکی جب اپنے رشتہ داروں سے کچھ وقت کے لئے الگ ہو کر بغرض عبادت ایک مکان میں داخل ہوئی تو اس پر ایک کشفی حالت طاری ہوئی اور اس نے اپنے سامنے ایک خوش رو اور تندرست و توانا مرد کو کھڑا پایا۔ اسے دیکھ کر وہ عفیفہ گھبرا گئی اور خیال کیا کہ یہ مردِ خوش رو کسی بد ارادے سے مکان میں داخل ہوا ہے۔ اس مرد نے لڑکی کی گھبراہٹ اور دہشت دور کرنے کی غرض سے اسے بتایا کہ وہ کوئی غلط آدمی نہیں بلکہ تیرے رب کا فرشتہ ہے اور اس لئے آیا ہے کہ تجھے ایک ایسے بیٹے کی بشارت دے جو دنیا اور آخرت دونوں میں نیک نام، صاحبِ منزلت اور وجیہہ ہو گا، جنابِ الٰہی میں قبول کیا جائے گا۔

فرشتے کی یہ بات سن کر یہ پاکباز لڑکی بڑے حیرت و استعجاب سے کہتی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ میں تو کنواری ہوں۔ بدکار بھی نہیں ہوں اور مجھے کسی مرد نے ہاتھ بھی نہیں لگایا پھر میرے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو جائے گا؟ اس سوال کا فرشتہ یہ احمقانہ جواب نہیں دیتا کہ ”میں تو مستقبل کی بابت کہہ رہا ہوں (جیسے نجومی ہاتھ دیکھ کر پیش

گوئی کیا کرتے ہیں کہ تمہارے ہاں دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہو گی) بلکہ وہ اس سے بڑے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ اے مریم! تم درست کہتی ہو، واقعی تم کنواری اور پاکباز ہو اور تمہیں کسی مرد نے ہاتھ بھی نہیں لگایا مگر تمہارا خدا کہتا ہے کہ میں ہر امر پر قادر ہوں اور میرے لئے یہ بہت آسان ہے کہ میں ایک کنواری کو مرد کی شرکت کے بغیر بیٹا دیدوں۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا فرشتہ لفظ "هین" استعمال کرتا ہے۔

قال ربک هو علی هین ج (یعنی اے مریم! تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ امر میرے لئے بہت آسان ہے)۔

سوچئے! کون سی چیز آسان ہے؟ کیا آسان ہے؟ کنواری کو بیٹا دے دینا یا شادی شدہ کو۔ شادی شدہ کو بیٹا دینے میں کوئی ایسی بات نہیں جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ یہ خدا کی قدرت سے پیدا ہوا۔ سارے بچے خدا کی قدرت ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی بانجھ عورت کے بیٹا پیدا ہو جائے تو ہر سننے والا بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ ----- "واقعی خدا کے لئے یہ آسان تھا"۔ "واقعی خدا قادر مطلق ہے"۔ "اس کے لئے کوئی بات کوئی امر ناممکن یا مشکل نہیں"۔

اسی طرح جب حضرت مریمؑ نے سنا کہ کنواری ہونے کے باوجود انہیں بیٹا دیا جائے گا تو انہیں اس پر سخت تعجب ہوا ان کی حیرت اور استعجاب دور کرنے کی غرض سے فرشتے نے کہا کہ اے مریم! اگرچہ تو کنواری ہے اور پاکباز بھی مگر اس کے باوجود خدا تجھے بیٹا دے گا کیونکہ وہ قادر مطلق ہے، اس کے لئے یہ کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس کے بعد جب حضرت مریمؑ کے بچہ پیدا ہونے کا وقت قریب آتا ہے تو آپؑ اپنے گھر سے چلی جاتی ہیں اور ایک نئی اور غیر آباد جگہ حضرت مسیحؑ کی ولادت ہوتی ہے۔ یہ کوئی کہانی نہیں بلکہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ○ (مریم آیت ۲۲)

پھر (مریم نے اپنے پیٹ میں بچہ) اٹھا لیا اور اسے لے کر دور کے مقام پر چلی گئیں۔)

یہ مقام کیسا تھا؟ وہاں کیا ماجرا پیش آیا؟ قرآن حکیم اس کی بھی وضاحت کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

فَنَادٰهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ○ الخ (مریم آیت ۲۴، ۲۶)

ترجمہ:۔ "پس (جبریل نے) نیچے کی سمت سے (حضرت مریم) کو آواز دی کہ تم غم نہ کرو تمہارے رب نے تمہارے نیچے کی جانب ایک چشمہ جاری کر رکھا ہے اس کے پاس جا کر اور جن کر فارغ ہو جاؤ اور (قریب ہی کھجور ہے) کھجور کی شاخ پکڑ کر ہلاؤ اس سے تم پر تازہ بہ تازہ پھل گریں گے پھر (یہ پھل) کھاؤ اور (چشمے سے) پانی پیو اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر لوگوں میں سے کوئی شخص تم سے (اعتراض کے رنگ میں کچھ کہے) تو اس سے کہہ دینا کہ آج میں نے اپنے اللہ کے لئے روزے کی منت مان رکھی ہے اس لئے آج میں کسی سے کلام نہیں کروں گی"۔

گویا حضرت مریمؑ ایک ایسے مقام پر تھیں جہاں کے محل وقوع کا بھی انہیں علم نہیں تھا۔ پھر یہ کہ کوئی رشتہ دار عورت بچے کی ولادت میں ان کی مدد کرنے کے لئے بھی موجود نہ تھی۔ یعنی پردیس اور سخت کس مپرسی کا عالم تھا۔ یہ بڑے غور کا مقام ہے کہ اگر وہ اپنے وطن یا اپنے کسی رشتہ دار کے گھر میں ہوتیں تو دردزہ کی حالت میں انہیں ایک غیر آباد مقام پر جانے کی کیا ضرورت تھی اور انہیں زندگی کے اس

نازک ترین مرحلے سے تنہا کیوں گذرنا پڑا جب ماں اور بچے دونوں کی زندگی سخت خطرے میں ہوتی ہے۔

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے پیٹ میں جو کچھ تھا وہ کسی باقاعدہ شادی کا نتیجہ نہ تھا، اس میں کسی انسان کا عمل دخل نہ تھا اسی لئے انگشت نمائی کے ڈر سے وہ اپنے وطن سے دور ایک غیر آباد مقام پر چلی گئی تھیں جس کے راستوں اور ارد گرد کے ماحول سے وہ قطعاً" ناواقف تھیں اسی لئے فرشتے نے ان کی رہنمائی کی اور انہیں بتایا کہ فلاں جگہ چلی جاؤ جو ولادت کے لئے موزوں ترین جگہ ہے، جہاں چشمہ بھی ہے اور کھجور کا درخت بھی جو پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ کھجور استعمال کرنے کی ہدایت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ نہ اس وقت اور نہ آئندہ چند روز میں انہیں ایسی قوت بخش غذائیں میسر آنے کا امکان تھا جو ایک زچہ کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ پس حضرت مریمؑ کا بچے کی ولادت کے لئے ایک غیر آباد اور دور دراز مقام پر منتقل ہو جانا صرف اور صرف اس وجہ سے تھا کہ چونکہ بچہ بغیر باپ کے پیدا ہونے والا تھا، اگر ان کے آبائی شہر یا ان کے شوہر کے گھر میں پیدا ہوتا تو قوم اور خاندان کے لوگ سخت دشنام طرازی کرتے۔ اس دشنام طرازی اور انگشت نمائی سے وقتی طور پر بچنے کی غرض سے وہ ایک دور دراز اور غیر آباد مقام کی طرف چلی گئیں"۔ (۱۰)

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت مریمؑ کو درد زہ اٹھتا ہے تو وہ لوگوں کی انگشت نمائی کے خوف سے فریاد کرتی ہیں کہ:۔

---

(۱۰) ماخوذ از "مسیحؑ کی بن باپ پیدائش" ص ۱۷

مولفہ پیام شاہجہانپوری شائع کردہ "ادارہ تاریخ و تحقیق" این ۲۳ ریواز گارڈن لاہور۔

يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ○

(مریم۔ ۲۳)

(ترجمہ:۔ کاش میں اس واقعے سے پہلے مرگئی ہوتی (اور ایسی نیست و نابود ہو جاتی کہ) کسی کو یاد تک نہ رہتی۔

اولادیں بہت سے پیغمبروں کی بیویوں کے ہوئیں جن میں سے دو کا قرآن حکیم نے بھی ذکر کیا ہے۔ ایک تو حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور ایک حضرت زکریاؑ کی بیوی۔ دونوں بانجھ تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو بیٹوں سے نوازا لیکن ان میں سے کسی کے درد زہ کی کیفیت کو قرآن حکیم بیان نہیں کرتا۔ ان کی فریاد و فغاں کو دنیا کے لئے محفوظ نہیں کرتا۔ آخر یہ حضرت مریمؑ کی آہ و بکا کو کیوں ریکارڈ پر لے آتا ہے، اور حضرت مریمؑ بچے کی ولادت کو ایسا واقعہ کیوں ٹھہراتی ہیں جو اس قدر بدنامی کا موجب ہے کہ وہ اللہ سے فریاد کرتی ہیں کہ تو نے اس واقعے سے پہلے مجھے موت دیدی ہوتی اور کاش میں اس طرح نیست و نابود کر دی گئی ہوتی کہ کسی کو میرا نام تک یاد نہ رہتا۔

اس فریاد اور آہ و بکا کی ایک ہی وجہ تھی کہ ان کے ہاں بے باپ کا بچہ پیدا ہونے والا تھا جس کی ولادت کے بعد انہیں سخت طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جانے والا تھا۔ اپنے اس انجام کا تصور کر کے اور بدنامی کے خوف سے وہ تڑپ رہی تھیں۔ ان کی اس تڑپ اور آہ و زاری کو قرآن حکیم نے محفوظ کر لیا تاکہ دنیا دیکھ لے کہ حضرت مریمؑ نے جو بچہ جنا تھا اس کا کوئی دنیاوی باپ نہیں اور وہ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پیدا ہوا تھا۔

گویا قرآن حکیم نے حضرت مسیحؑ کی ولادت کے واقعے کی جزئیات تک بیان کر

دیں، پوری ترتیب سے بیان کیں اور اس طرح بیان کیں تاکہ پڑھنے والوں کو یقین ہو جائے کہ واقعی حضرت مسیحؑ کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی جبکہ انجیل نویس اس واقعے کی تفاصیل بیان نہیں کر سکے نہ ان میں ترتیب قائم کر سکے اور نہ کوئی ایسا تاثر دے سکے جس سے اس دعوے کو سپورٹ ملتی کہ واقعی حضرت مسیحؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے جبکہ قرآن کریم ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا واقعہ اس خوش اسلوبی سے بیان کرتا چلا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن پر تمام واقعات پورے تسلسل کے ساتھ مرتسم ہوتے چلے جاتے ہیں اور جب وہ سارا بیان پڑھ لیتا ہے تو اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ واقعی حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ بغیر باپ کے پیدا ہوا۔

کاش کارلائل عیسائیت کو اسلام پر فضیلت دیتے وقت صرف ولادت مسیحؑ کے واقعے ہی کو پڑھ کر انجیل اور قرآن کا موازنہ کر لیتے تو اپنے پیش رو مسیحی مصنفین اور متعصب پادریوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا شکار نہ ہوتے۔

بائیبل کا تضاد

ہمارا خیال ہے کہ کارلائل کے عہد میں قرآن اور بائیبل کا تقابلی مطالعہ بھی نہیں کیا جا سکا اگر ایسا ہو جاتا تو کارلائل کی کتاب اس قسم کی علمی و فکری کمزوریوں سے پاک رہتی۔ آیئے اس نقطۂ نظر سے بھی غور کریں کہ کیا موجودہ بائیبل اس قابل ہے کہ اس پر مبنی مذہب کو اسلام پر ترجیح دی جا سکے۔

ہم ایک بار پھر اعتراف کرتے ہیں کہ بائیبل میں شامل ساری کتابیں (سوائے ESTHER (آستر) جیسی ایک آدھ کتاب کے آسمانی صحائف ہیں اور بلاشبہ ان کی بنیاد صدق و راستی پر ہے یہ جن انبیاء پر نازل ہوئیں وہ سچے اور خدا کے مقدس نبی تھے مگر بعد کے زمانوں میں ان کتابوں کو تغیر و تبدل کا نشانہ بنایا گیا جس کا اعتراف خود

انہی کتب مقدس میں کیا گیا ہے چنانچہ بنی اسرائیل کے ایک راست باز نبی حضرت "یرمیاہؑ" بیان فرماتے ہیں:۔

> "تم کیوں کر کہتے ہو کہ ہم تو دانشمند ہیں اور خدا کی شریعت ہمارے پاس ہے؟ لیکن دیکھو لکھنے والوں کے باطل قلم نے بطالت پیدا کی ہے۔(۱۱)

گویا حضرت "یرمیاہؑ" فرما رہے ہیں کہ اے بنو اسرائیل! تمہارے پاس جو شریعت ہے وہ خدا کی خالص شریعت ہرگز نہیں کیونکہ لکھنے والوں نے یعنی اس کی نقل کرنے والوں نے جن کا قلم باطل تھا اس میں بطالت (جھوٹ) شامل کر دیا یعنی اس تعلیم کو بگاڑ دیا۔ حضرت یرمیاہؑ کے بقول خدا کی شریعت (توریت) اب ہرگز خدا کی شریعت نہیں رہی، اسے مسخ کر دیا گیا ہے۔

یہی حضرت یرمیاہؑ اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔

> "تم نے زندہ خدا، رب الافواج ہمارے خدا کے کلام کو بگاڑ ڈالا ہے۔"(۱۲)

یہاں نہایت صاف طور پر خدا کا ایک مقدس نبی قوم کو سرزنش کر رہا ہے کہ تم نے ایک ایسا جرم کیا ہے کہ اب کبھی نبوت کا نام بھی نہ لینا۔ وہ جرم کیا ہے؟ فرمایا کہ تم نے ہمارے خدا کے کلام کو بگاڑ ڈالا، اس میں تغیر و تبدل کر دیا۔ وہ اس حالت پر باقی نہیں رہا جس حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اب اس کی چند

---

(۱۱) یرمیاہ باب ۸۔ آیت ۸

(۱۲) یرمیاہ باب ۲۳۔ آیت ۳۶

مثالیں، جن سے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا کا نبی یرمیاہؑ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ تھا اور بائیبل میں بہت تبدیلیاں کردی گئیں، دانستہ اور نادانستہ دونوں طرح۔

بائیبل کے باب پیدائش میں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

> "اور خداوند نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا
> پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے ○ لیکن نیک و بد کی پہچان
> کے درخت کا کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے
> کھایا تو مرا ○" (۱۳)

یہی بائیبل کہتی ہے کہ اس تنبیہہ کے باوجود حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی دونوں نے پھل کھالیا:۔

> "عورت (حضرت حوا) نے .... اسکے پھل میں سے لیا اور کھایا
> اور اپنے شوہر (حضرت آدم) کو بھی دیا اور اس نے کھایا" (۱۴)

بائیبل کے ارشاد کی رو سے پھل کھاتے ہی حضرت آدم کو مر جانا چاہئے تھا لیکن یہی بائیبل کہتی ہے کہ:۔

> "اور آدم کی عمر نو سو تیس برس کی ہوئی تب وہ مرا" (۱۵)

یعنی پھل کھانے کے قریباً ایک ہزار سال تک حضرت آدم زندہ رہے۔ کیا اس سے زیادہ واضح تضاد ہو سکتا ہے۔

حضرت ایوبؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں خدا کے جلیل القدر نبی تھے دونوں

---

(۱۳) کتاب پیدائش باب ۲۔ آیت ۱۶

(۱۴) کتاب پیدائش باب ۳ آیت ۶

(۱۵) کتاب پیدائش باب ۵۔ آیت ۵

خدا سے تعلیم یافتہ تھے اور دونوں کی تعلیم کا سر چشمہ ایک ہی تھا لیکن بائیبل ان دونوں مقدس پیغمبروں کی طرف متضاد تعلیم منسوب کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت ایوبؑ فرماتے ہیں:۔

> "شریر کا چراغ گل کر دیا جائے گا اور اس کی آگ کا شعلہ بے
> نور ہو جائے گا"۔ (۱۶)

دوسری طرف حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

> "ان شریروں کو دیکھو یہ سدا چین سے رہتے ہوئے دولت
> بڑھاتے ہیں۔" (۱۷)

اس سے پہلے اسی کتاب میں حضرت سلیمانؑ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ "میں شریروں کو اقبال مند دیکھتا ہوں۔ ان کی قوت بنی رہتی ہے۔ اور آدمیوں کی طرح مصیبت میں نہیں پڑتے۔ نہ اور لوگوں کی طرح ان پر آفت آتی ہے"۔ (آیت ۳ تا ۵)

کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا ایک نبی تو شریر کی ہلاکت کا پیغام دے اور دوسرا اس کی اقبال مندی کی نوید سنائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے دونوں کتابوں کی تحریر اور نقل میں دانستہ یا نادانستہ کوتاہی ہوئی۔

"تواریخ" بائیبل کی بہت مشہور کتاب ہے جس میں بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد کے تاریخی حالات بیان کئے گئے ہیں اور اس کتاب کو بھی الہامی اور آسمانی کتاب قرار دیا گیا ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے کتاب اول اور کتاب دوم۔ کتاب

---

(۱۶) کتاب ایوب باب ۱۸۔ آیت ۵

(۱۷) زبور کتاب ۳ آیت ۱۲

اول میں حضرت داؤدؑ ”یو آب“ نامی سردار کو بنی اسرائیل کی مردم شماری کا حکم دیتے ہیں۔ بائیبل اس مردم شماری کی تعداد بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

> ”سب اسرائیلی گیارہ لاکھ شمشیرزن مرد اور یہوداہ (کے) چار لاکھ ستر ہزار شمشیرزن مرد تھے (۱۸)

گویا کل پندرہ لاکھ ستر ہزار جنگجو افراد موجود تھے جبکہ بائیبل ہی کی کتاب ”سموئیل“ میں جو حضرت سموئیلؑ پیغمبر کی طرف منسوب ہے اس مردم شماری کی تعداد اس طرح بیان کی گئی ہے:۔

> ”اور ”یو آب“ نے مردم شماری کی تعداد بادشاہ (حضرت داؤدؑ) کو دی، سو، اسرائیل میں ۸ لاکھ بہادر مرد نکلے جو شمشیرزن تھے اور یہوداہ کے مرد پانچ لاکھ نکلے“۔ (۱۹)

گویا کل تعداد ۱۳ لاکھ ہوئی جبکہ بائیبل کی دوسری کتاب (تواریخ) یہ تعداد پندرہ لاکھ ستر ہزار بیان کرتی ہے اس طرح دونوں آسمانی کتابوں میں چند سو یا چند ہزار کا نہیں بلکہ دو لاکھ ستر ہزار کا فرق ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی باتوں میں نہ مبالغہ ہوتا ہے، نہ اختلاف ہوتا ہے، نہ اس کے اندازے اور اطلاعات غلط ہوتی ہیں پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ بائیبل نویسوں نے اسے نقل کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا اور اس کے بیان کردہ واقعات اور اعداد و شمار قابل اعتبار نہیں رہے۔

اسی قسم کا ایک اور اختلافی بیان حضرت ”سموئیل“ پیغمبر سے منسوب کتاب اول میں موجود ہے۔ ساؤل جو حضرت داؤدؑ کا پیشرو اسرائیلی بادشاہ تھا اس کی موت کو

---

(۱۸) تواریخ ۱ باب ۲۱۔ آیت ۵

(۱۹) سموئیل کتاب ۲ باب ۲۴۔ آیت ۹

دو طریقے سے بیان کیا گیا ہے:۔

> ”اور جنگ ساؤل پر نہایت بھاری ہو گئی اور تیر اندازوں نے اسے جا لیا اور وہ تیر اندازوں کے سبب سے سخت مشکل میں پڑ گیا ○ تب ساؤل نے اپنے سلاح بردار سے کہا، اپنی تلوار کھینچ اور اس سے مجھے چھید دے ایسا نہ ہو کہ یہ نامختون آئیں اور مجھے چھید لیں اور مجھے بے عزت کریں پر اس کے سلاح بردار نے ایسا کرنا نہ چاہا کیونکہ وہ نہایت ڈر گیا تھا اس لئے ساؤل نے اپنی تلوار لی اور اس پر گرا..... اور ساؤل مر گیا“۔ (۲۰)

گویا بادشاہ ساؤل نے خودکشی کر لی لیکن اسی ”سموئیل“ نامی کتاب کے دوسرے حصے میں ساؤل کی موت کی بالکل متضاد کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کہانی کی رو سے ساؤل کو ایک عمالیقی نوجوان نے قتل کیا۔ اس واقعے کی تفصیل ”سموئیل“ میں یوں بیان کی گئی ہے:۔

> ”ایک شخص لشکر گاہ میں سے ساؤل کے پاس سے پیراہن چاک کئے اور سر پر خاک ڈالے ہوئے آیا اور جب وہ داؤدؑ کے پاس آیا تو زمین پر گرا اور سجدہ کیا ○
>
> اس کے بعد وہ نوجوان جو ساؤل کا قاتل تھا خود اعتراف قتل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ:۔
>
> ساؤل اپنے نیزے پر جھکا ہوا ہے اور رتھ اور سوار اس کا پیچھے کئے آ رہے ہیں ○ اور جب اس نے اپنے پیچھے نگاہ کی تو مجھ کو

---

(۲۰) سموئل کتاب ۱۔ آیت ۳ تا ۵

> دیکھا اور مجھے پکارا میں نے جواب دیا میں حاضر ہوں ○ اس
> نے مجھے کہا تو کون ہے؟ میں نے جواب دیا میں عمالیقی ہوں ○
> پھر اس نے مجھ سے کہا میرے پاس کھڑا ہو کر مجھے قتل کر ڈال
> کیونکہ میں بڑے عذاب میں ہوں اور اب تک میرا دم مجھ میں
> ہے ○ تب میں نے اس کے پاس کھڑے ہو کر اسے قتل کیا
> ..... اور میں اس کے سر کا تاج اور بازو پر کا کنگن لے کر ان کو
> اپنے خداوند کے پاس لایا ہوں ○ (۲۱)

یہ سن کر حضرت داؤدؑ اپنے کپڑے پھاڑ کر ساؤل کی موت کا ماتم کرتے ہیں اور اس عمالیقی نوجوان کو یہ کہہ کر قتل کروا دیتے ہیں کہ اس کا خون اسی کی گردن پر ہے کیونکہ اس نے اپنے منہ سے ساؤل کو قتل کرنے کی گواہی دی۔

اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو پہلا واقعہ غلط ہے جس کی رو سے ساؤل نے اپنے آپ کو اپنی تلوار پر گرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا گویا خود کشی کر لی تاکہ فلستی قوم کے لوگ جو اس کے تعاقب میں تھے اس پر قابو پا کر اس کی لاش کی بے حرمتی نہ کریں یا دوسرا واقعہ غلط ہے جس کے مطابق ساؤل نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا بلکہ اسے ایک عمالیقی نے مارا۔ عجیب بات ہے کہ دونوں متضاد بیانات ایک ہی کتاب "سموئیل" میں درج ہیں' ایک کتاب کے پہلے حصے میں اور دوسرا کتاب کے دوسرے حصے میں۔

اسی قسم کا تضاد حضرت آدمؑ اور حیوانوں کی پیدائش کے بارے میں ہے کہ کون پہلے پیدا ہوا۔ حضرت آدمؑ کو پہلے تخلیق کیا گیا یا حیوانوں کو؟ بائیبل کہتی ہے کہ اللہ

---

(۲۱) سموئل کتاب ۲۔ باب ۱۔ آیت ۲ تا ۱۱

تعالیٰ نے زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی بے روح اور بے جان اشیاء کو چار روز میں پیدا کیا۔ پانچویں روز اس نے پرندوں اور دریائی جانوروں کو پیدا کیا۔ چھٹے روز اس نے چوپایوں اور رینگنے والے جانوروں کو پیدا کیا پھر -----:۔

> "خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند
> بنائیں..... اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا (۲۲)

گویا اس بیان کی رو سے پہلے حیوان پیدا کئے گئے پھر آخر میں انسان لیکن اسی کتاب پیدائش کے دوسرے باب میں اس سے بالکل متضاد بیان موجود ہے:۔

> "اور خداوند خدا نے کہا آدم کا اکیلا رہنا اچھا نہیں۔ میں اس
> کے لئے ایک مددگار (حضرت حوا) اس کی مانند بناؤں گا ○ اور
> خداوند خدا نے کل دشتی جانور اور ہوا کے کل پرندے مٹی
> سے بنائے اور ان کو آدم کے پاس لایا ○ (۲۳)

اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا گیا ان کی پیدائش کے بعد جانور اور پرندے پیدا کئے گئے۔ اب ان دونوں میں سے کون سا بیان درست ہے؟ اگر بائیبل آسمانی کتابوں کا مجموعہ ہے اور یہ کتابیں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں تو ان میں یہ اختلاف کیوں ہے۔ متضاد بیانات کیوں ہیں؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بائیبل نویسوں نے واقعات کو نقل کرتے ہوئے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اس میں ان کی بھول کو بھی دخل ہے' ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حافظے کے ساتھ ساتھ ان کا حساب بھی کمزور تھا۔

---

(۲۲) پیدائش باب ۱۔ آیت ۲۶

(۲۳) پیدائش باب ۲۔ آیت ۱۸ تا ۱۹

انبیا کی ہتک

بائیبل کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس میں خدا کے مقدس انبیا کا ذکر بہت ہی اہانت آمیز طریقے سے کیا گیا ہے۔ ہم ایک سیکنڈ کے لئے بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ بائیبل میں جو آسمانی صحائف شامل ہیں ابتدا ہی سے ان کی یہی صورت چلی آ رہی ہے۔ ہرگز نہیں جب یہ صحائف آسمانی نازل ہوئے تھے تو وہ بالکل بے عیب تھے ان میں اس قسم کی خرافات کا شائبہ تک نہ تھا یہ ساری تکلیف دہ باتیں بعد میں شامل کی گئیں' چند مقامات:

حضرت نوحؑ کے ساتھ بائیبل کا سلوک

حضرت نوحؑ کتنے جلیل القدر پیغمبر تھے جنہیں آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے' اپنے ملک میں وہ ایک نئی نسل انسانی کے آدم اور ایک نئی تہذیب و معاشرت اور ایک جدید تمدن کے بانی تھے مگر اس بانیء تہذیب کا جو نقشہ بائیبل پیش کرتی ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:۔

> اور نوح کاشتکاری کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا○ اور اس نے مئے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہو گیا○ اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا اور اپنے دونوں بھائیوں کو باہر آکر خبر دی○ تب سم اور یافت نے ایک کپڑا لیا اور اسے اپنے کندھوں پر دھرا اور پیچھے کو الٹے چل کر گئے اور انہوں نے اپنے باپ کی برہنگی ڈھانکی.....
> جب نوح اپنی مئے کے نشے سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا اسے معلوم ہوا○ اس نے کہا کنعان ملعون ہو۔ (۲۴)

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ خدا کا ایک جلیل القدر نبی اتنی شراب پیتا ہے کہ بدمست ہو کر برہنہ ہو جاتا ہے۔ اس کی برہنگی ڈھانپنے کے لئے اس کا بیٹا آگے بڑھتا ہے اور اس کی ستر پوشی کرتا ہے۔ مگر یہ عظیم المرتبت نبی اپنے اس حیادار بیٹے پر لعنت بھیجتا ہے۔ اس غریب کا کیا قصور تھا؟ بائیبل یہ نہیں بتاتی۔

قرآن کا نوحؑ

اب دیکھئے کہ قرآن کریم نوح علیہ السلام کو کس ادب و احترام سے یاد کرتا ہے اور ان کے کردار کی کیسی صاف ستھری اور پاکیزہ تصویر پیش کرتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

"ونوحا" ھدینا" (الانعام۔ ۸۴)
(اور ہم نے نوح کو ہدایت عطا کی تھی)

پھر فرمایا:۔

"اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا الخ (آل عمران۔ ۳۳)
(یقیناً اللہ تعالیٰ نے آدم اور نوح کو (اپنے لئے) چن لیا تھا اور انہیں تمام عالموں پر فضیلت عطا کی تھی)

ان آیات کریمہ میں حضرت نوحؑ کا مقام متعین فرمایا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ وہ کس مرتبے کے انسان تھے؟ فرمایا وہ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے۔ خدا نے انہیں اپنے لئے منتخب کر لیا تھا اور اس عہد کی ساری نسل انسانی میں سے صرف انہیں اپنے لئے چنا تھا اور (اس وقت کی) ساری دنیا پر فضیلت دی تھی۔ ایک معمولی فہم کا آدمی بھی جانتا ہے کہ خدا اپنے لئے شرابیوں اور نشہ بازوں کو نہیں چنا

---

(۲۴) پیدائش باب ۹۔ آیت ۲۰ تا ۲۵

کرتا۔ وہ ان لوگوں کو دنیا کی اصلاح کے لئے نہیں بھیجتا جو اس قدر شراب پیئیں کہ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہے اور ان کی اولادیں تک ان کی برہنگی کا تماشہ دیکھیں جیسا کہ بائیبل میں حضرت نوحؑ کی برہنگی کا تماشہ دکھایا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے نوح کو ہدایت سے نوازا تھا' جناب نوح ہدایت یافتہ تھے۔ جو لوگ خدا سے ہدایت یافتہ ہوں وہی دوسروں کو صحیح رنگ میں ہدایت دے سکتے ہیں اور جو لوگ دوسروں کو ہدایت دیتے ہیں ان کا عمل نہایت پاکیزہ ہوتا ہے مگر ایک نشہ باز اور شراب کے نشے میں دھت ہو جانے والا شخص کسی کو کیا ہدایت دے گا اور اس کی ہدایت میں کیا تاثیر پیدا ہو گی؟ خود بائیبل ایسے شخص کی سخت مذمت کرتی ہے اور اسے تنبیہہ کرتی ہے چنانچہ فرمایا کہ:۔

"اور شراب میں متوالے نہ بنو کیونکہ اس سے بدچلنی واقع
ہوتی ہے" (۲۵)

اسی طرح عہد نامہ ء جدید کے مختلف مقامات پر شرابیوں حتیٰ کہ شرابی کے ساتھ کھانے پینے والے تک سے تعلقات رکھنے سے روکا گیا ہے (۲۶) اور اسے کوڑے مارنے کا حکم ہے' ایسے لوگوں کو منصب و عہدہ تک دینے سے منع کیا گیا ہے (۲۷)۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انجیل میں تو شراب پینے اور نشہ میں بدمست ہونے والے کی مذمت کی گئی ہو' اس فعل کو بدکاری کا سبب بیان کیا گیا ہو اور خدا کا ایک مقدس اور جلیل القدر پیغمبر جو نسل انسانی کا دوسرا باپ کہلاتا ہے وہ خود شراب پی کر اتنا

---

(۲۵) انجیل۔ افسیوں کے نام۔ باب ۵۔ آیت ۱۸

(۲۶) متی کی انجیل۔ باب ۲۴۔ آیت ۴۹' ۵۰' ۵۱

(۲۷) انجیل تیمتھیس کے نام۔ باب ۳۔ آیت ۱ تا ۳

بدمست ہو جائے کہ اسے اپنی برہنگی کا بھی ہوش نہ رہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بائیبل کا کھلا تضاد ہے۔ اس کے برعکس قرآن کریم نے خدا کے اس پیغمبر پر نہ صرف شراب نوشی کا الزام نہیں لگایا بلکہ اسے اس الزام سے پاک کر دیا اور اعلان فرما دیا کہ وہ (نوحؑ) اللہ کے ان خاص بندوں میں سے تھے جنہیں اس نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا' وہ اپنے عہد کے سارے انسانوں سے افضل تھے اور انہیں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا گیا تھا ----- یہ ہیں قرآن کے نوحؑ ----- پاک سیرت' پاک طینت' پاک کردار۔

حضرت لوطؑ سے بائیبل کا سلوک

اور آگے چلئے۔ حضرت ابراہیم کے بھتیجے اور اپنے زمانے کے عظیم پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام سے بائیبل نے کیا سلوک کیا؟ اس کی تفصیل بیان کرنے سے ہمارا دل لرزتا ہے اور تہذیب بائیبل کا یہ مقام نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ احتیاط اور ادب کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم صرف اس قدر بیان کرنے پر اکتفا کریں گے کہ بائیبل کی رو سے حضرت لوطؑ کی دو بیٹیوں نے آپؑ کو شراب پلائی اور جب آپؑ مدہوش ہو گئے تو باری باری آپؑ کے ساتھ ہم بستر ہوئیں۔ (۲۸) (استغفراللہ۔ استغفراللہ۔ استغفراللہ)

آگے چل کر بیان کیا گیا ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں اپنے باپ سے حاملہ ہو گئیں۔ ان سے (حرام کی) نسل چلی جو یقیناً آج بھی دنیا میں موجود ہو گی بلکہ بائیبل کی رد سے یہ نسلیں:

"اب بھی موجود ہیں"۔ (۲۹)

---

(۲۸) بائیبل کی کتاب پیدائش۔ باب ۱۹۔ آیت ۳۰ تا ۳۵

(۲۹) بائیبل کی کتاب پیدائش۔ باب ۱۹۔ آیت ۳۸

قرآن کا لوطؑ

اس کے برعکس قرآن جس لوطؑ کی تصویر پیش کرتا ہے وہ تو بدیوں کے خلاف جہاد کرنے والا پیغمبر تھا۔ وہ تو اپنی قوم کو سرزنش کرتا تھا کہ "تم لوگ ایسی خطرناک بدیوں کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے کبھی نہیں کیں"۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ الۡیَسَعَ وَ یُوۡنُسَ وَ لُوۡطًا ؕ
وَ کُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ (الانعام۔ ۸۶)

(اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی (ہم نے ہدایت
سے نوازا تھا) اور انہیں (اپنے اپنے زمانے میں) سارے
جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی)

پھر سورہ الشعراء کی آیات ۱۶۰ تا ۱۶۶ کے مطابق جناب لوطؑ قوم کے ان اخلاق رذیلہ کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں وہ مبتلا تھی، ان میں امرد پرستی، ڈاکہ زنی اور ہر قسم کی شہوت رانی شامل ہے۔ آپؑ قوم کو ان خبائث سے روکتے ہیں اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیا خدا کے ایک عظیم پیغمبر سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ قوم کو تو اخلاق رذیلہ سے باز رہنے کی تلقین کرے، تقویٰ و پرہیزگاری اور خوف خدا کی نصیحت کرے اور خود اس کے گھر کا ماحول یہ ہو کہ اس کی جوان بیٹیاں بدکاری کریں اور بدکاری بھی اپنے بوڑھے (پیغمبر) باپ کے ساتھ -----؟ قرآن ایسے لوط کی تصویر پیش نہیں کرتا وہ ایسے لوط کی تصویر پیش کرتا ہے جو خود بھی پرہیزگار تھا اور اپنے اہل کو بھی پرہیزگاری کی نصیحت کرتا تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے زمانے میں سب جہانوں پر فضیلت دی تھی اور اسے اپنے لئے چن لیا تھا۔ یہ ہے قرآن کا لوطؑ۔

حضرت موسیٰؑ سے بائیبل کا سلوک

خدا کے ایک اور بہت ہی مقدس اور جلیل القدر نبی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بھی بائیبل اہانت آمیز سلوک کرتی ہے اور انہیں ایک ایسے مرض میں مبتلا کرتی ہے جو دنیا کا سب سے قابلِ نفرت مرض ہے چنانچہ لکھا ہے:

"پھر خداوند نے اسے (حضرت موسیٰؑ کو) یہ بھی کہا کہ تو اپنا ہاتھ
اپنے سینے پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر
رکھ کر اسے ڈھانپ لیا اور جب اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ
کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا (۳۰)

تاریخ انبیا شہادت دیتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ خدا کے نبی معجزے اس لئے دکھاتے ہیں تاکہ مخالفین اور منکرین پر ان کی صداقت ثابت ہو جائے، ان کا رعب قائم ہو جائے مگر یہاں خدا کا ایک پیغمبر ایسا "معجزہ" دکھا رہا ہے جو الٹا اس کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا موجب ثابت ہو رہا ہے یعنی پہلے تو اسے کوئی بیماری لاحق نہیں تھی، اس کے جسم کے سارے اعضا صحتمند تھے لیکن جب وہ معجزہ دکھانے کے لئے اپنا ہاتھ سینے کے ساتھ لگا کر باہر نکالتا ہے تو وہ کوڑھ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط

قرآن کا موسیٰؑ

اس کے برعکس قرآن جس موسیٰؑ کا تصور پیش کرتا ہے وہ اپنی قوم اور اپنے مخالفین میں سُبکی اور اعتراضات کا نشانہ نہیں بنتا، اس کا مضحکہ نہیں اڑایا جا سکتا۔

---

(۳۰) کتاب خروج باب ۴۔ آیت ۶

بائیبل کی طرح قرآن بھی حضرت موسیٰؑ کے اس معجزے کا ذکر کرتا ہے مگر یہ معجزہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ بائیبل کے بیان کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:۔

> وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى (طٰہٰ ۔ ۲۲)
>
> (یعنی اے موسیٰؑ) تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دبالو (پھر نکالو) وہ بلا کسی بیماری یا عیب کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا۔ یہ ایک اور نشانِ (عظیم) ہو گا)

دیکھ لیجئے ایک بائیبل ہے جو خدا کے ایک عظیم پیغمبر کو کوڑھ کا مریض ثابت کر رہی ہے اور ایک قرآن ہے جو خدا کے اس عظیم پیغمبر کو اس الزام سے پاک کر رہا ہے اور اس کے مخالفین کے سامنے اس عظیم پیغمبر کی وہ تصویر پیش کر رہا ہے جو شایانِ نبوت ہے۔ یہ ہے قرآن کا موسیٰؑ۔ عظیم اور پاکباز موسیٰؑ۔

حضرت یعقوبؑ سے بائیبل کا سلوک

حضرت یعقوب علیہ السلام کتنے راست باز اور خدا کے کس قدر محبوب پیغمبر تھے جنہیں خود خداوند تعالیٰ نے "اسرائیل" کے مبارک لقب سے نوازا اور ان کی نسل کو وہ فضیلت بخشی اور ایسے انعامات کا وارث بنایا کہ اس وقت کی معلوم تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی لیکن اتنے عظیم پیغمبر کے اخلاق و کردار کا جو نقشہ بائیبل نے پیش کیا ہے وہ تو حد درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ پیغمبر تو کیا معمولی اخلاق کا شخص بھی ایسی گھٹیا اور سفاکانہ حرکات نہیں کرتا۔ اس کی کچھ تفصیل----!

بائیبل کہتی ہے کہ حضرت اسحاقؑ کے دو بیٹوں عیسو اور یعقوبؑ میں چشمک تھی۔ عیسو حضرت اسحاقؑ کا بڑا بیٹا تھا اور حضرت یعقوبؑ اس سے چھوٹے تھے۔

اگرچہ عیسو پہلوٹھا ہونے کی وجہ سے باپ کا جانشین بننے کا زیادہ مستحق تھا مگر حضرت یعقوبؑ باوجود چھوٹا بیٹا ہونے کے بڑے بھائی کی جگہ لینا چاہتے تھے چنانچہ بائیبل کی رو سے انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی درماندگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے اس کے پہلوٹھا ہونے کا حق مسور کی دال کے عوض خرید لیا چنانچہ لکھا ہے:۔

> "اور یعقوب نے دال پکائی اور عیسو جنگل سے آیا اور بے دم ہو رہا تھا ○ اور عیسو نے یعقوب سے کہا کہ یہ جو لال لال ہے مجھے کھلا دے کیونکہ میں بے دم ہو رہا ہوں اسی لئے اس کا نام ادوم بھی ہو گیا ○ تب یعقوب نے کہا تو آج اپنا پہلوٹھے کا حق میرے ہاتھ بیچ دے ○ عیسو نے کہا میں تو مرا جاتا ہوں پہلوٹھے کا حق میرے کس کام آئے گا ○ تب یعقوب نے کہا آج ہی مجھ سے قسم کھا۔ اس نے قسم کھائی اور اس نے پہلوٹھے کا حق یعقوب کے ہاتھ بیچ دیا ○ تب یعقوب نے عیسو کو روٹی اور مسور کی دال دی ○ (۳۱)

اگر بائیبل کے اس بیان کو درست مان لیا جائے تو ثابت یہ ہو گا کہ جس شخص کی تصویر کتاب مقدس دکھا رہی ہے وہ بہت ہی سنگ دل اور سفاک تھا کہ بڑا بھائی ---- حقیقی بھائی ---- بھوک سے بے دم ہو رہا ہے' ایک روٹی اور تھوڑی سی مسور کی دال سے اس کی زندگی بچ سکتی ہے مگر یہ کہتا ہے کہ پہلے اپنے پہلوٹھا ہونے کا حق میرے ہاتھ بیچ تب میں تجھے روٹی اور مسور کی دال دوں گا (گویا مرتا ہے تو مرجا) اور جب تک بڑے بھائی نے اپنا یہ حق اس کے ہاتھ نہ بیچ دیا اس نے اسے روٹی کے چند لقمے اور مسور کی دال کا پیالہ نہ دیا۔ پیغمبر ہونا تو کجا ایسا شخص تو انسانیت

---

(۳۱) کتاب پیدائش باب ۲۵۔ آیت ۲۹

ہی کے دائرے سے خارج ہے۔ یہ ہے بائیبل کا پیغمبر یعقوبؑ؟ حالانکہ خدا کے اس مقدس پیغمبر کا دامن ایسے اخلاقِ رذیلہ سے پاک تھا وہ تو بہت ہی عظیم انسان تھے دنیا کے لئے نمونہ بن کر آئے تھے۔

آگے چلئے، حضرت یعقوبؑ کی صفائی کی تصویر دکھانے کے بعد بائیبل ان کے چہرے سے ایک اور نقاب الٹتی ہے اور اب جو یعقوبؑ نظر آتا ہے اس کی بھی ایک جھلک ------! بائیبل کے بقول:۔

حضرت اسحاقؑ ضعیف ہو چکے تھے۔ ان کی بینائی بھی جاتی رہی تھی، ایک روز انہوں نے اپنے بڑے فرزند عیسو کو بلایا اور اس سے کہا کہ اے میرے بیٹے! اب میں بہت ضعیف ہو گیا ہوں اور معلوم نہیں کب فوت ہو جاؤں پس تو تیر کمان لے کر جنگل کو جا اور وہاں سے شکار مار کر لا اور میرا پسندیدہ کھانا تیار کر کے میرے سامنے رکھ تاکہ میں کھاؤں اور مرنے سے پہلے تجھے برکت کی دعا دوں۔ جس وقت حضرت اسحاقؑ اپنے بیٹے عیسو سے گفتگو کر رہے تھے تو ان کی بیوی ربقہ اپنے شوہر کی باتیں سن رہی تھیں، وہ عیسو کے مقابلے میں اپنے چھوٹے بیٹے حضرت یعقوبؑ کو زیادہ چاہتی اور ان کی ولی عہدی کی خواہشمند تھیں چنانچہ جب عیسو اپنے باپ کے لئے شکار مارنے چلا گیا تو ربقہ نے حضرت یعقوبؑ کو بلایا اور ان سے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل میں نے تیرے باپ کو عیسو سے یہ کہتے سنا ہے کہ جنگل کو جا کر میرے لئے شکار مار کر لا اور لذیذ کھانا تیار کر کے میرے آگے رکھ تاکہ اسے کھا کر خداوند خدا کے آگے تیرے لئے دعا کروں۔ پس اے میرے بیٹے! جو حکم میں تجھے دیتی ہوں اس کی تعمیل کر۔ تو جا اور اپنے باپ کے ریوڑ سے بکری کے دو صحتمند بچے مجھے لا دے تاکہ میں تیرے باپ کے لئے لذیذ کھانا تیار کروں جسے کھا کر مرنے سے پہلے وہ (عیسو کی بجائے) تیرے لئے دعا کرے۔

یہ سن کر حضرت یعقوبؑ نے اپنی ماں سے کہا کہ اے ماں! مجھے آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں لیکن میرے بھائی عیسو کے جسم پر تو بال ہیں اور میرے جسم پر بال نہیں ہیں اگر باپ نے میرا جسم ٹٹولا تو (اس دھوکے بازی کا پول کھل جائے گا) میں اپنے باپ کی نظر میں دغاباز ٹھہروں گا اور برکت کی بجائے لعنت کماؤں گا۔ حضرت یعقوبؑ کا جواب سن کر ماں بولی بیٹا! تیری لعنت مجھ پر آئے تو میری بات مان اور بکری کے دو بچے لے آ۔ بچے آ گئے، انہیں ذبح کیا گیا کھانا تیار ہوا۔ اس کے بعد دھوکے بازی کا دوسرا ڈرامہ شروع ہوتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کی والدہ نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کا نفیس لباس حضرت یعقوبؑ کو پہنایا۔ بکری کی کھال ان کے بازوؤں پر باندھی اور کچھ گردن پر۔ پھر کھانا دے کر انہیں حضرت اسحاقؑ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ حضرت یعقوبؑ (نعوذ باللہ) یہ سوانگ بھر کر اپنے نابینا باپ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ اے باپ میں حاضر ہوں۔ انہوں نے دریافت کیا تو کون ہے؟ حضرت یعقوبؑ نے جواب دیا کہ میں آپ کا پہلوٹھا بیٹا عیسو ہوں (۳۲) اور آپ کے حکم کے مطابق کھانا تیار کر کے لایا ہوں تاکہ کھا کر آپ مجھے دعا دیں۔ حضرت اسحاقؑ پہلے تو اتنی جلد شکار مار کر لے آنے اور پھر کھانا تیار ہو جانے پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ اس پر حضرت یعقوبؑ (نعوذ باللہ) دھوکے بازی کے اس فعل کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اس کے فضل سے اتنی جلدی سارا کام ہو گیا"۔ یہ سن کر حضرت اسحاقؑ فرماتے ہیں کہ اچھا ذرا میرے قریب تاکہ میں تجھے ٹٹول کر دیکھوں کہ واقعی تو میرا بڑا بیٹا عیسو ہی ہے؟ حضرت یعقوبؑ باپ کے قریب جاتے ہیں۔ وہ آپؑ کو ٹٹول کر کہتے ہیں

---

(۳۲) کتاب پیدائش باب ۲۷۔ آیت ۱۹

----- "آواز تو یعقوبؑ کی ہے مگر ہاتھ عیسو کے ہیں"۔ اس کے بعد حضرت اسحاقؑ نے کھانا کھایا پھر خوب شراب پی جو پیغمبر یعقوبؑ اپنے پیغمبر باپ کے لئے لائے تھے اور انہیں جام بھر بھر کر پلائی۔ اس کے بعد حضرت اسحاقؑ نے حضرت یعقوبؑ کو قریب بلا کر کہا مجھے چومو! مقصد یہ تھا کہ حضرت یعقوبؑ نے جو لباس پہنا ہوا تھا اس کی خوشبو سے اندازہ ہو سکے کہ یہ بڑا بیٹا عیسو ہے یا چھوٹا بیٹا یعقوبؑ -----؟ مگر چونکہ ہوشیار اور "منصوبہ ساز" ماں نے سارا منصوبہ بہت ذہانت اور چالاکی سے تیار کیا تھا اور حضرت یعقوبؑ کو ان کے بڑے بھائی عیسوؑ کا لباس پہنا دیا تھا اس لئے وہ دھوکا کھا گئے اور لباس کی خوشبو سونگھ کر انہیں پورا یقین ہو گیا کہ واقعی یہ میرا پہلوٹھا بیٹا عیسو ہی ہے جو میری نیابت کا مستحق ہے پس انہوں نے اسے دعا دی کہ:۔

> دیکھو میرے بیٹے کی مہک اس کھیت کی مانند ہے جسے خدا نے
> برکت دی ہو۔ خدا آسمان کی اوس اور زمین کی فربہی اور بہت
> سا اناج اور مے تجھے بخشے ○ قومیں تیری خدمت کریں اور
> قبیلے تیرے سامنے جھکیں تو اپنے بھائیوں کا سردار ہو۔ (۳۳)

گویا اس طرح حضرت یعقوبؑ دھوکا دے کر اپنے پیغمبر باپ سے اپنے حق میں دعا کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ بلاشبہ یہ دعا تو قبول ہو گئی اور حضرت یعقوبؑ کو وہ عروج و اقبال نصیب ہوا کہ اس عہد کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا----- مگر ٹھہرئے! یہی نکتہ اس سارے معاملے میں KEY (کلید) کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہی دعا قبول ہوتی ہے جس کی بنیاد خلوص اور صداقت پر ہو لیکن جس دعا کے پیچھے مکر و فریب، جھوٹ اور ریاکاری

کارفرما ہو وہ ہرگز قبول نہیں ہوتی لیکن یہ دعا تو قبول ہوئی اور بڑی شان سے قبول ہوئی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ جس کے حق میں دعا کی گئی تھی وہ سراپا اخلاص تھا، صدق و صفا کا پیکر تھا پس اس سے مکر و فریب اور دھوکے بازی کا جو ڈرامہ بائیبل نویسوں نے منسوب کیا وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ یوں بھی خدا کے پیغمبر اس قسم کے ڈرامے نہیں کیا کرتے۔ نہ وہ دھوکے باز ہوتے ہیں۔ پیغمبر اور دھوکا دے؟ دھوکا بھی اپنے نابینا باپ کو دے ------ پھر خدا کے مقدس پیغمبر اور ایک عام بلکہ پست کردار شخص میں کیا فرق باقی رہ گیا؟

قرآن کا یعقوبؑ

بائیبل کے برعکس قرآن جس یعقوبؑ کو پیش کرتا ہے وہ نہایت صاحب علم اور پاکیزہ خصلت پیغمبر تھا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

> يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ الخ
> (صٓ۔ ۲۶)
>
> (اے داوٗد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے سو لوگوں میں
> انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور آئندہ بھی نفسانی
> خواہش کی پیروی نہ کرنا (اگر ایسا کرو گے تو) وہ تمہیں خدا کے
> راستے سے بھٹکا دے گی.....)

ایک اور مقام پر حضرت داوٗدؑ کے بارے میں فرمایا کہ ہم نے انہیں علم و حکمت عطا کی تھی (سورۂ نمل۔ ۱۵)

قرآن پیغمبر تو کجا صاحب ایمان مومنوں کی بھی یہ شان بیان کرتا ہے کہ وہ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے خود اس پر عمل کرتے ہیں اور ان کے قول و فعل میں اختلاف و تضاد نہیں ہوتا۔ قرآن حضرت داوٗدؑ کی جو تصویر ہمیں دکھاتا ہے اس

---

(۳۳) پیدائش باب ۲۷۔ آیت ۲۷

کی رو سے وہ عادل تھے اور صاحب علم انسان تھے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ سب سے پہلے اپنی ذات سے انصاف کیا جائے۔ ذات سے انصاف یہ ہے کہ انسان دوسروں کا حق نہ مارے۔ اسی طرح علم کا تقاضا ہے کہ نہ اپنے نفس کو دھوکا دے نہ دوسروں کو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں حضرت داؤدؑ کی دو صفات بیان کر کے آپؑ کو بائیبل کے تمام الزامات سے پاک کر دیا۔ اول یہ کہ آپؑ عادل تھے دوسرے یہ کہ صاحب علم و حکمت تھے۔ عادل کی حیثیت سے آپ نے سب سے پہلے اپنی ذات سے انصاف کیا، پھر اپنے اقربا سے انصاف کیا۔ آپؑ نے اپنے کسی قریبی عزیز کا حق نہیں مارا نہ اپنے بزرگ باپ سے فریب کیا کیونکہ عالم کی حیثیت سے آپؑ جانتے تھے کہ اگر آپؑ ایسا کریں گے تو راہ راست سے بھٹک جائیں گے جس سے (قرآن کی رو سے) اللہ تعالیٰ آپؑ کو متنبہ کر چکا تھا اور راہ راست دکھا چکا تھا۔ پس بائیبل کا یہ کہنا کہ حضرت داؤدؑ نے روٹی کے چند ٹکڑوں اور مسور کی دال کے ایک پیالے کے عوض اپنے بھوکے بھائی کا حق خرید لیا قرآن نے غلط ثابت کر دیا۔ اسی طرح قرآن نے اس الزام کی بھی تردید کر دی کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے بزرگ باپ کو دھوکا دے کر بڑے بھائی کا حق مار لیا اور اس کی بجائے خود ولی عہدی حاصل کر لی۔ قرآن کی رو سے یہ طریق مکرو فریب ہے اور حضرت داؤدؑ عادل تھے آپؑ کا دامن ایسی سفیہانہ حرکات سے پاک تھا ------ یہ ہیں قرآن کے داؤدؑ ---- صاحبِ عدل داؤدؑ ------ صاحبِ علم داؤدؑ۔

حضرت سلیمانؑ سے بائیبل کا سلوک

حضرت یعقوبؑ کے بعد موجودہ بائیبل بنی اسرائیل کے ایک اور جلیل القدر پیغمبر حضرت سلیمانؑ کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور یوں ان کی تصویر کشی کرتی ہے:

> "اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی

> عورتوں سے یعنی موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حتی عورتوں سے محبت کرنے لگا ○ یہ ان قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تم ان کے بیچ نہ جانا اور نہ وہ تمہارے بیچ آئیں کیونکہ وہ ضرور تمہارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کر لیں گی۔ سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا ○ اور اس کے پاس سات سو شہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا ○ کیونکہ جب سلیمان بڈھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا دل تھا ○ کیونکہ سلیمان صیدانیوں کی دیوی عستارات اور عمونیوں کے نفرتی ملکوم کی پیروی کرنے لگا ○ اور سلیمان نے اپنے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی جیسی اس کے باپ داؤد نے کی تھی ○ پھر سلیمان نے موآبیوں کے نفرتی کموس کے لئے اس پہاڑ پر جو یروشلم کے سامنے ہے اور بنی عمون کے نفرتی مولک کے لئے بلند مقام بنایا ○ اس نے ایسا ہی اپنی سب اجنبی بیویوں کی خاطر کیا جو اپنے دیوتاؤں کے حضور بخور جلاتی اور قربانی گذارتی تھیں ○
>
> اور خدا سلیمان سے ناراض ہوا کیونکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے پھر گیا تھا جس نے اسے دو بار دکھائی دے

کر○ اس کو اس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی
نہ کرے پر اس نے وہ بات نہ مانی جس کا حکم خداوند نے دیا تھا
○" (۳۴)

گویا بائیبل خود اپنے مقدس پیغمبر پر پانچ الزامات عائد کرتی ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) کو حکم دیا تھا کہ بنو اسرائیل بت پرست اقوام کی بیٹیوں سے شادیاں نہ کریں جن کی نشاندہی بھی کر دی گئی تھی مگر حضرت سلیمانؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور شریعت اسرائیلی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی اور انہی کی بیٹیوں سے شادیاں کر لیں۔

(۲) حضرت سلیمانؑ جب تک جوان رہے اس وقت تک تو خیر رہی لیکن جب انہیں بڑھاپے نے آ پکڑا ان کے جسم اور ارادے میں کمزوری در آئی تو بت پرست قوموں سے تعلق رکھنے والی ان کی یہ بیویاں ان پر غالب آ گئیں اور انہوں نے خدا کے اس پیغمبر کو (نعوذ باللہ) گمراہ کر لیا اور وہ ان کے بہکاوے میں آ کر اپنی بیویوں کی خوشنودی کی خاطر ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگا۔

(۳) حضرت سلیمان کی سات سو بیویاں تو وہ تھیں جنہیں انگریزی کی بائیبل "Royal Wives" کے الفاظ سے یاد کرتی ہے یعنی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی بیویاں اور تین سو بیویاں وہ تھیں جنہیں انگریزی بائیبل میں "Mistresses" یعنی داشتائیں یا محبوبائیں کہا گیا ہے اور حضرت سلیمانؑ کو Lover of women یعنی "عورتوں کا رسیا" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ (۳۵)

---

(۳۴) کتاب سلاطین (۱) باب ۱۱ آیت ۱۱

(35) THE BIBLE (I, KINRS) II-3

(۴) حضرت سلیمانؑ اپنی ان بت پرست محبوباؤں کے حسن و جمال اور عشوہ و ادا سے اس حد تک مغلوب ہو گئے کہ ان کی خاطر کوہ یروشلم کے سامنے بت خانے تعمیر کروائے جہاں بتوں کے سامنے قربانیاں گذاری جاتی تھیں۔

(۵) حضرت سلیمانؑ کی ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ (نعوذ باللہ) ان کا دل خدا کی طرف سے پھر گیا اور پھر خدا ان سے ناراض ہو گیا گویا اسی حالت کفر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط

شاید ہی دنیا کے کسی پیغمبر کی ایسی قابل شرم تصویر کسی آسمانی کتاب میں دکھائی گئی ہو۔

قرآن کا سلیمانؑ

اس کے برعکس قرآن جس سلیمانؑ کی تصویر پیش کرتا ہے وہ تو بہت ہی عظیم اور خدا کا شکر گذار پیغمبر تھا، فرمایا:۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا

الخ (الانبیا۔۷۹)

قرآن حکیم کے اس ارشاد کی رو سے حضرت سلیمانؑ اور ان کے والد گرامی حضرت داوٗدؑ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوت فیصلہ عطا فرمائی تھی انہیں علم و حکمت کی دولت سے نوازا تھا۔ بہت بڑی سلطنت بخشی تھی۔ حربی صنعت کے اسرار و رموز تعلیم فرمائے تھے۔ بحر و بر دونوں پر قبضہ و اقتدار عطا فرمایا تھا۔ اس عظیم مملکت کے بڑے بڑے سرکش سرداروں کو آپؑ (حضرت سلیمان) کا تابع فرمان بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ان احسانات عظیم کے نتیجے میں حضرت سلیمانؑ کو تو اپنے رب کریم کا بے حد شکر گذار ہونا چاہئے تھا مگر بائیبل کہتی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کا صلہ یہ دیا کہ حسین و جمیل اور پری چہرہ عورتوں کے عشق میں مبتلا ہو گئے

اور تھوڑی نہیں بلکہ سات سو بیگمات کے باوجود تین سو بت پرست داشتائیں مزید شاہی محل میں رکھ لیں۔ پھر ان بت پرست داشتاؤں کی خاطر بت پرستی شروع کردی گویا سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ انجام یہ کہ بائیبل کے بقول ان کا دل خدا کی طرف سے پھر گیا"۔ (نعوذ باللہ)

دوسری طرف قرآن کہتا ہے کہ:۔

وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ○ (صٓ۔۴۰)

(اس (سلیمان) کو ہماری جناب میں قرب خاص حاصل ہے اور ہمارے پاس اس کے لئے بہت اچھا ٹھکانا ہے۔

اس سے پہلے فرمایا:۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ط نِعْمَ الْعَبْدُ ط اِنَّهٗ اَوَّابٌ ○

(صٓ۔۳۰)

(اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا تھا وہ ہمارا بہت ہی اچھا بندہ اور (اپنے) خدا کی طرف بار بار جھکنے والا تھا)

اس طرح قرآن حکیم نے حضرت سلیمانؑ کے اس سوانحی خاکے کو رد کردیا جو بائیبل نے پیش کیا جس کی رو سے وہ ایک عیاش، مغلوب الشہوات، عورتوں کے رسیا، بت پرست اور خدا کے نافرمان ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ سلیمانؑ خدا کا مقرب بندہ تھا، اس کا دل خدا کی طرف سے ہرگز نہیں پھرا، ایک لمحے کے لئے بھی وہ خدا کی یاد سے غافل نہ ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ "ہمارے پاس اس کا اچھا ٹھکانا ہے" ------ اگر حضرت سلیمانؑ بائیبل کی رو سے شہوت کے بھوکے، بت پرست اور خدا کے نافرمان ہوتے تو قرآن کے الفاظ میں "ان کے لئے اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا" کبھی نہ ہوتا اور نہ قرآن انہیں "نعم العبد" کے الفاظ سے یاد کرتا یعنی اللہ

کا بہت ہی اچھا بندہ۔

یہ ہے قرآن کا سلیمانؑ جس پر نہ صرف یہ کہ قرآن کوئی الزام نہیں لگاتا بلکہ اسے بائیبل کے ہر الزام سے پاک کر کے ایک ایسے پیغمبر عظیم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جو علم و حکمت کا پیکر، خدا کا فرماں بردار، سفلی جذبات سے پاک و منزہ اور اپنے خدا کی طرف بار بار جھکنے والا پیغمبر تھا۔

بائیبل میں اللہ تعالیٰ کی ہتک

اب ایک نظر اس رویئے پر بھی ڈال لیجئے جو اس کتاب مقدس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ روا رکھا گیا۔ دنیا کا ہر مذہب اس نظریئے اور عقیدے کا قائل ہے کہ اس کائنات کا اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ اسی نے اس عالم رنگ و بو کو محض اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا اور اس پر اپنا حکم جاری کیا لیکن بائیبل تخلیق کائنات کو اللہ تعالیٰ کا ایسا فعل قرار دیتی ہے جس نے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو مضمحل کردیا اور وہ تھک کر چور ہوگیا۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"چھ دن میں خداوند نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کر کے تازہ دم ہوا ○

"آرام کرنے" اور "تازہ دم" ہونے کے الفاظ پر اگر کسی کو شبہ ہو کہ انگریزی سے ترجمہ کرنے والے نے شاید غلط ترجمہ کردیا اور غلط متبادل الفاظ درج کردئے تو اس شبہ کے ازالے کے لئے انگریزی بائیبل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

THE ETERNAL MADE SKY AND EARTH AND THEN RESTED, TO REFRESH HIMSELF UPON THE SEVENTH DAY".(36)

---

(36) THE BIBLE EXODUS (31-17)

گویا بائیبل کے انگریزی ایڈیشن کا مفہوم بھی وہی ہے جو اردو ایڈیشن کا کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن تازہ دم ہونے کی غرض سے آرام کیا۔

اب بالکل سامنے کی بات ہے کہ آرام کرنے کی ضرورت اسی کو پیش آتی ہے جو تھک جاتا ہے اور تازہ دم بھی وہی ہوتا ہے جس کا "دم" مضمحل ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں کمزوریاں اسی وجود کو لاحق ہوتی ہیں جس کی صلاحیتیں محدود ہوں اور ایک مقام پر پہنچ کر جواب دیدیں کہ "اب ہم میں اس سے زیادہ بوجھ اٹھانے اور کام کرنے کی طاقت نہیں"۔ یعنی ع

آگے چلیں گے دم لے کر

جب تک ستانہ لیں، تھوڑا سا آرام نہ کر لیں اس وقت تک ہم مزید کام نہیں کر سکیں گے کیونکہ ہمارے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ گویا بائیبل ایسے خدا کا تصور پیش کرتی ہے جس کی صلاحیتیں محدود ہیں، ایک حد سے آگے نہیں جا سکتیں۔ اسے بھی انسانوں کی طرح کام کرنے کے بعد آرام کی ضرورت پیش آتی ہے ورنہ وہ اپنا کارخانہ نہیں چلا سکتا اور اگر کبھی وہ آرام کرنا بھول جائے (کیونکہ محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بھول جانا بھی لازمی ہے) تو اس کی یہ کائنات ایک دھماکے کے ساتھ زیروزبر ہو جائے۔

جناب کارلائل سے پوچھا جا سکتا تھا کہ کیا یہی وہ مسیحیت ہے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام اس کی بگڑی ہوئی شکل ہے؟ بائیبل جس پر مسیحیت کی بنیاد قائم ہے وہ تو اس کائنات کے خالق کو بھی ایک کمزور وجود کی شکل میں پیش کرتی ہے جسے وہ تمام کمزوریاں لاحق ہیں جو انسانوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ وہ تھک بھی جاتا ہے، بھول بھی جاتا ہے اور اپنے غلط افعال پر اظہار ندامت بھی کرتا ہے چنانچہ

بائیبل کہتی ہے کہ:۔

> "اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا برے ہی ہوتے ہیں ○ تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا ○ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا روئے زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان سے لے کر حیوان اور رینگنے والے جاندار اور ہوا کے پرندوں تک کیونکہ میں ان کے بنانے سے ملول ہوں ○ (۳۷)

ملول وہی ہوتا ہے، غم بھی اسی کو ہوتا ہے جس سے کوئی غلط فعل سرزد ہو جائے، پشیمانی اسی کو ہوتی ہے، وہی شرمندہ ہوتا ہے جس سے کوئی قابل شرم حرکت صادر ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بقول بائیبل خود اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے افعال کے نتائج کا علم نہیں ہوتا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ جس آدم کو تخلیق کر رہا ہے اس کی نسل میں ایسے بدکردار لوگ بھی پیدا ہوں گے جو زمین کو ناراستی اور ظلم و ستم سے بھر دیں گے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کو ندامت ہوئی کہ اس نے کیسا غلط کام کر دیا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ نسل آدم میں اس قدر غلط کار لوگ پیدا ہوں گے تو وہ کبھی اسے (آدمی) پیدا نہ کرتا گویا بائیبل کی رو سے اللہ تعالیٰ کا علم بھی ناقص ہے۔ پھر وہ عدل کی صفت حسنہ سے بھی محروم ہے کہ برے اور بدکار لوگوں کے ظلم و ناراستی کی وجہ سے وہ نیک فطرت اور پاک سرشت لوگوں کو بھی مٹا دے گا۔ یہی نہیں بلکہ فرماتا ہے کہ میں انسان سے لے کر حیوانوں، رینگنے والے جاندار

---

(۳۷) کتاب پیدائش باب ۶ ۔ آیت ۵ تا ۷

اور ہوا کے پرندوں تک کو مٹا ڈالوں گا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ زمین پر ظلم تو انسانوں نے کیا اور سزا ہوا کے پرندوں کو دی جا رہی ہے۔ گویا خدا غصے میں بالکل آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ ہے موجودہ بائیبل کا خدا-----؟ یہ ہے بائیبل-----؟ جس پر مبنی مذہب کو اسلام سے برتر و افضل قرار دیا جا رہا ہے اور کارلائل صاحب اسلام کو اس کی بگڑی ہوئی شکل قرار دے رہے ہیں۔

قرآن کا خدا

آیئے دیکھیں کہ اسلام جس خدا کا تصور پیش کرتا ہے اس کی کیا شان ہے؟ فرماتا ہے کہ:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا
فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (ق-۳۸)

(یعنی زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب اشیا کو ہم نے چھ اوقات میں پیدا کیا اور ہم تھکے نہیں)

جبکہ بائیبل کہتی ہے کہ زمین و آسمان کو پیدا کر کے اللہ تھک گیا اور ساتویں دن اس نے آرام کیا تاکہ تازہ دم ہو جائے۔ ہمیں بتایا جائے ناقص تعلیم بائیبل کی ہے یا قرآن کی؟

پھر فرماتا ہے کہ:۔

"لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ الخ (البقرہ-۲۵۵)

(اور اللہ تعالیٰ کو) نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند (اس کے قریب سے ہو کر بھی نہیں گزر سکتی)۔

مزید فرمایا کہ:۔

وَلَا یَؤُدُهٗ حِفْظُهُمَا الخ (البقرہ-۲۵۵)

(یعنی آسمانوں اور زمین کی وہی حفاظت کرتا ہے اور) ان کی حفاظت اسے تھکا نہیں سکتی۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ:۔

وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا ۝ (مریم-۶۴)

(اور تمہارا رب بھولا نہیں کرتا)

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چار صفات بیان فرمائی ہیں:۔

(۱) وہ تھکتا نہیں (۲) نہ اسے اونگھ آتی ہے (۳) نہ وہ نیند کا محتاج ہے (۴) اللہ تعالیٰ کا حافظہ کمزور نہیں وہ بھولا نہیں کرتا۔

اس طرح قرآن حکیم نے ان تمام کمزوریوں کی نفی کر دی جو بائیبل نے اللہ تعالیٰ سے منسوب کی تھیں۔ بائیبل کہتی ہے کہ انسان کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ پچھتایا اور اس نے اظہار افسوس کیا۔ گویا اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا یہ "شاہکار" ناقص ثابت ہو گا جبکہ قرآن اس کی نفی کرتا اور اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل کا تصور پیش کرتا ہے۔ فرمایا:۔

وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ الخ (البقرہ-۲۵۵)

(اور اس کا علم زمین و آسمان پر محیط ہے)

یعنی اس کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی ماہیت اور جس کے افعال کا اللہ تعالیٰ کو علم نہ ہو۔ اسے خوب معلوم تھا کہ وہ جن اشیا کو پیدا کر رہا ہے ان سے کس قسم کے افعال صادر ہوں گے اس لئے وہ اپنے کسی فعل پر کبھی افسوس نہیں کرتا نہ اسے پچھتاوا ہوتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا:۔

وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الخ (آل عمران-۲۹)

(اور اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور اس سے بھی خوب واقف ہے جو زمین میں ہے) اس سے پہلے اسی آیت میں فرمایا کہ (اے رسول) آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے۔ (آل عمرٰن۔۲۹)

ایک اور مقام پر فرمایا:۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الخ (الرعد۔۹)

(اللہ تعالیٰ موجود اور غیر موجودہ دونوں کے بارے میں کامل علم رکھتا ہے) یعنی وہ اشیا اور مخلوق جو پیدا ہو چکی ہیں اور جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں۔ سب کے بارے میں اسے علم ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ کا علم ہر لحاظ سے کامل ہے اور ساری کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر موجود اور غیر موجودہ چیز جو ابھی ظاہر نہیں ہوئی) پر حاوی ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آدم اور نسل آدم کے ان افعال سے واقف نہ ہو تا جو ان سے صادر ہونے والے تھے چونکہ اسے بنی نوع انسان کی خوبیوں اور خامیوں کا پورا علم حاصل تھا کیونکہ وہ اس کے دست قدرت میں سے نکلے تھے اس لئے وہ انسان کو پیدا کر کے اور ان کی حرکات دیکھ کر ہرگز ملول اور رنجیدہ نہیں ہوا اور نہ اپنے اس فعل پر پچھتایا، کیونکہ ملول ہونا اور پچھتانا تو کمزوریاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہر کمزوری سے پاک ہے چنانچہ خود اس کا ارشاد ہے کہ:۔ "سُبْحَانَ اللّٰهِ"

اللہ تعالیٰ ہر کمزوری سے پاک ہے کیونکہ اگر وہ کمزوریوں سے
پاک نہیں تو "سبحان" نہیں۔

قرآن اور تخلیق کائنات

ہم اس سے قبل بھی بیان کر چکے ہیں کہ بائیبل میں شامل کتب مقدسہ الہامی ہیں۔ اگرچہ بعد میں ان میں بہت سی تحریف کردی گئی اس کے باوجود بہت سی بنیادی صداقتیں ان میں آج بھی موجود ہیں جن کی قرآن کریم نے تصدیق کردی چونکہ بائیبل اور قرآن دونوں کا نازل کرنے والا ایک ہی ہے اس لئے اس نے اپنے رسول ﷺ پر وہ بہت سی باتیں وحی کردیں جو اس سے پہلے بائیبل میں بیان ہو چکی تھیں مگر وہ قصے کہانیاں جو بعد میں بائیبل میں شامل ہو گئے قرآن میں انہیں بیان نہیں کیا گیا۔ تخلیق کائنات بائیبل کا ایک مستقل باب بلکہ ایک مستقل کتاب ہے جسے کتاب پیدائش کا نام دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی اشیاء کی تخلیق کے واقعات بیان کئے گئے ہیں مگر قرآن کریم نے انہیں پوری صحت اور زیادہ تفصیل سے بیان کیا۔ مثال کے طور پر بائیبل کہتی ہے:

اور خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا ساتویں دن ختم کیا اور اپنے
سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا ساتویں دن فارغ ہوا○ (۳۸)

دوسری طرف اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ:۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ
كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط
(ھود۔۷)

(وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ اوقات میں پیدا کیا
اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ وہ آزمائش کرے کہ تم میں سے

---

(۳۸) کتاب پیدائش باب ۲ آیت ۲

کس کے اعمال زیادہ اچھے ہیں)

دونوں کتابوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی اشیاء کو چھ دنوں میں پیدا کیا مگر قرآن نے اسے زیادہ وضاحت اور جامعیت سے بیان کیا اور مقصد تخلیق بھی بیان کر دیا۔ یعنی وہ دیکھنا چاہتا ہے اور اپنے بندوں کو احساس دلانا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون اللہ تعالیٰ کے احکام کی زیادہ تعمیل کرتا ہے۔ گویا اس نے انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا اور نہ وہ بائیبل کے بیان کی طرح انسان کو پیدا کر کے پچھتایا بلکہ اس نے تخلیق آدم کا ایک مقصد سامنے رکھا اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اسے ذمہ داریاں تفویض کیں۔ اسے ہدایات دیں۔ یہ جو فرمایا کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ عربی میں عرش قوت و اقتدار کو کہتے ہیں اور پانی کا لفظ وحی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام چلانے کے لئے انسان کو تخلیق کیا اور اسے ہدایات دینے کے لئے ایک روحانی نظام قائم کیا جس کے تحت وہ انبیاء' اولیا اور صلحا دنیا میں بھیجتا رہتا ہے اور انہیں وحی و الہام کے ذریعے اپنے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہے تاکہ یہ قدسی نفوس بنی نوع انسان کو گمراہیوں سے بچاتے رہیں اور اللہ کے بندوں میں خیر و فلاح تقسیم کرتے رہیں۔ یہی مطلب ہے خدا کے عرش کا اور یہی مطلب ہے عرش الٰہی کے پانی پر قائم ہونے کا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات کو ایک خاص مقصد کے لئے تخلیق کیا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ اس کے بندوں میں نیکی اور بدی دونوں کا ادراک پیدا کر دیا جائے۔ یہ ادراک خود بخود تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی فطرت میں ایک ایسا مادہ رکھ دیا جو انہیں بتا دیتا ہے کہ وہ جو کام کر رہے ہیں وہ اچھا ہے یا برا۔ دوسرا انتظام اس نے یہ کیا کہ اپنے بندوں کی رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً ایسے قدسی نفوس دنیا میں بھیجے جو اس سے وحی و الہام پا کر بنی نوع انسان کی

رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

تخلیق کائنات کی مدت

اس میں شک نہیں کہ بائیبل کی طرح قرآن بھی تخلیق کائنات کی مدت چھ یوم ہی مقرر فرماتا ہے مگر وہ "یوم" کو سورج نکلنے اور سورج ڈوبنے کے درمیان محدود نہیں کرتا یعنی قرآن "یوم" سے ہر جگہ چوبیس گھنٹے کا دن مراد نہیں لیتا۔ عربی میں یوم کے معنی ہیں ----- "الوقت مطلقاً" (۳۸ الف)

یعنی ایسا وقت جس کی حد بندی نہ کی جا سکے جو ایک لاکھ' ایک کروڑ' ایک ارب سال بھی ہو سکتا ہے گویا قرآن کریم اس کائنات کی تخلیق کے عمل کو چند دنوں' چند مہینوں یا چند برسوں میں محدود نہیں کرتا بلکہ اسے ایک طویل ارتقائی پروسیس کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ہمارے اس نظریئے کی تائید خود قرآن مجید سے ہوتی ہے۔ کتاب اللہ کی پہلی آیت ہے:۔

الحمد للہ رب العالمین ○

(ہر تعریف کا صرف اللہ تعالیٰ ہی مستحق ہے جو تمام عالمین' تمام زمانوں اور تمام دنیاؤں کا رب ہے)

عربی میں "رب" کے ایک معنی پرورش کرنے والے کے ہیں اور "رب" کے دوسرے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی ادنیٰ حالت سے ترقی دے کر اعلیٰ حالت تک پہنچانے والا۔ گویا قرآن کی رو سے یہ کائنات ابتدا میں بہت ادنیٰ حالت میں تھی جسے قرآن ہی میں "دخان" کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ:۔

(۳۸۔الف) عربی میں یوم کے بہت سے معنی ہیں ان میں سے ایک معنی ہیں "الدھر" یعنی زمانہ یا دور۔ دوسرے معنی ہیں "الوقت مطلقاً" (لسان العرب جلد نمبر ۱۲ ص ۶۵۰۔ اشاعت دار الصدر۔ بیروت)

ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ الخ (حم السجدہ۔۱۱)

(پھر وہ آسمان کی (تخلیق) کی طرف متوجہ ہوا اور اس وقت وہ دھواں سا تھا)

یعنی ابتدا میں آسمان دھویں یا حرارت آمیز گیس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پھر اس نے آسمان کی تخلیق کا عمل اس طرح جاری فرمایا کہ یہ سات درجوں یا سات ادوار میں منقسم ہو گیا۔ پھر فرمایا:۔

وَ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَھَا ؕ (حم السجدہ۔۱۲)

یعنی رفتہ رفتہ ان آسمانوں میں اس نے وہ تمام صلاحیتیں پیدا کر دیں جو ان کے لئے ضروری تھیں اور ان میں موجود کروں (ستاروں) کو اس طرح تخلیق کیا کہ ان کے ذریعے سے زمین کی حفاظت کا سامان پیدا ہو گیا اور یہ سب ایک کشش کے ذریعے آپس میں مربوط ہو گئے۔ وہی کشش انہیں نہ ایک دوسرے سے ٹکرانے دیتی ہے اور نہ گرنے دیتی ہے اور یہ سب اپنے اپنے مقررہ راستوں پر گردش کر رہے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الۡحُبُکِ ○ (الذاریت۔۷)

(یعنی قسم ہے آسمان کی کہ اس میں (ہم نے ستاروں کے) چلنے کے راستے (بنائے) ہیں)

پھر فرمایا کہ:۔

وَ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ○ (یٰسین۔۴۰)

(اور یہ سب ایک مقرر شدہ راستے پر (ایک دائرے میں) تیر رہے ہیں)

گویا اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک نظام کے تحت تخلیق کیا ہے اور ان میں

سے کوئی سیارہ اپنے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا اور یہ سب چشم زدن میں اچانک نہیں ہو گیا بلکہ رفتہ رفتہ ہوا اور کائنات کی ہر چیز نے ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ حالت حاصل کی۔

قرآن کہتا ہے کہ آسمان کی طرح زمین بھی اچانک نہیں بن گئی بلکہ یہ بھی ترقی کرتی ہوئی دو یوم یعنی دو وقتوں یا دو ادوار میں سے گذر کر اپنے موجودہ مقام تک پہنچی چنانچہ فرمایا:۔

قُلۡ اَئِنَّکُمۡ لَتَکۡفُرُوۡنَ بِالَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ الخ (حم السجدہ۔۹)

(یعنی ان سے کہئے کہ کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو ۲ یوم (ادوار) میں پیدا کیا)

اس کے بعد فرمایا کہ اس میں بسنے والوں کے لئے ہم نے خوراک کی تمام اشیاء کو ایک اندازے کے مطابق پیدا کر دیا۔ فرمایا یہ عمل بھی ہم نے چشم زدن یعنی پلک جھپکنے میں انجام نہیں دے دیا بلکہ:۔

فِیۡۤ اَرۡبَعَۃِ اَیَّامٍ ؕ الخ (حم السجدہ۔۱۱)

(یہ سب کچھ چار ایام (ادوار) میں پایہ تکمیل کو پہنچا)

پھر ایک اور نکتہ جسے آج سائنس نے دریافت کیا ہے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:۔

وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ط (الانبیاء۔۳۰)

(اور ہم نے ہر چیز کو پانی میں زندہ کیا)

یعنی قرآن کی رو سے زندگی کا آغاز پانی میں ہوا۔ سائنس بھی کہتی ہے کہ حیات (زندگی) کا نقطہ (CELL) سب سے پہلے پانی میں پیدا ہوا اور پانی ہی میں اس نے

ارتقائی منازل طے کیں اور پھر پانی ہی میں اس کی تعداد میں اضافہ شروع ہوا۔ ان میں سے بعض نے پانی میں سے نکل کر زمین پر رہائش اختیار کرلی مگر آغاز سب کا پانی ہی میں ہوا۔

زمین کی گردش کا قرآنی نظریہ

اسلام اور قرآن پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کے افکار و تصورات سائنس سے متصادم ہیں اور پھر یہ غلط بات اسلام سے منسوب کردی گئی اس کی تعلیمات کے مطابق زمین ساکن ہے حالانکہ ہرگز ایسا نہیں قرآن تو اس کے برعکس نظریہ پیش کرتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ
فَاِذَا ہِیَ تَمُوۡرُ ○ (الملک۔۱۶)

(کیا تم آسمان میں موجود اس ہستی سے بے خوف ہو گئے ہو جو تمہیں دنیا میں ذلیل کردے اور دیکھ لو کہ وہ (زمین) چکر کھا رہی ہے)

اس سے پہلی آیت میں فرمایا کہ بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ جس نے (یہ کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر شے کو) پیدا کیا ہو وہی اس کی حقیقت سے بے خبر ہو۔

گویا اس کائنات کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے معلوم نہ ہو کہ کون سی چیز کس حالت میں ہے اور کب تک اس حالت میں رہے گی؟ چونکہ وہ زمین کا بھی خالق ہے اور اس کی باریک سے باریک کنہہ سے بھی واقف ہے جس سے اس کے بندے تو کروڑوں اور اربوں سال کے بعد جا کر واقف ہوں گے (وہ بھی محدود طور پر) پس وہ اعلان فرماتا ہے زمین ساکن و جامد نہیں بلکہ گردش کر رہی ہے اور اس کی یہی گردش ایک دن تمہیں ہلاک کردے گی۔

تخلیق آدم کا بائیبلی نظریہ

بائیبل کہتی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا۔ اسے کس طرح بنایا؟ سنئے:۔

> اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا ○ اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ ○ (۳۹)

تخلیق آدم کا قرآنی نظریہ

آیئے دیکھیں کہ قرآن کریم آدم کی تخلیق کے بارے میں کیا فرماتا ہے۔ اس موازنے سے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ مسٹر کارلائل کے اس دعوے میں کہاں تک وزن ہے کہ مسیحیت اسلام سے افضل و برتر ہے اور اسلام مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

قرآن بائیبل کی اس کہانی کی ہرگز تصدیق نہیں کرتا کہ خدا تعالیٰ نے:۔

DUST OF THE GROUND (40)

> یعنی زمین کی گرد و غبار جمع کر کے اس سے آدم کا پتلا بنایا اور پھر اس کے نتھنوں میں پھونک مار کر اسے "جیتی جان انسان" بنا دیا۔

قرآن اس قسم کے ڈراموں کو مکمل طور پر رد کرتا ہے۔ جس طرح اس نے

---

(۳۹) کتاب پیدائش باب ۲۔ آیت ۷ تا ۹

(40) THE BIBLE (GENESIS) 2-7

تخلیق کائنات کا ایک فلسفہ پیش کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ یہ کائنات تخلیق کے ایک ارتقائی عمل سے گذر کر موجودہ حالت تک پہنچی اسی طرح کائنات میں پائی جانے والی ہر چیز (جس میں انسان بھی شامل ہے) ارتقائی مراحل سے گذری یعنی اپنی ابتدا میں انسان موجودہ شکل میں نہ تھا بلکہ اس کی کوئی اور ہی شکل تھی چنانچہ قرآن حکیم اس طرف بہت ہی لطیف رنگ میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ
يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ○ (الدھر-۱)

(کیا (اس) دنیا میں انسان پر ایک ایسا وقت نہیں آیا جب وہ ایک
ناقابل ذکر اور بے حقیقت (وجود) تھا)

یعنی اس دور میں وہ اس طرح زندگی گذار رہا تھا کہ اس کی کوئی حرکت' اس کا کوئی کام قابل ذکر نہیں تھا اور ظاہر ہے یہ وہی دور تھا جب انسان پانی اور مٹی کے تخلیقی دور سے گذر رہا تھا جب اس کا ہیولیٰ اور پیکر تخلیق پا رہا تھا' ابھی وہ خشکی پر آکر اپنا موجودہ وظیفہء حیات انجام دینے کے قابل نہ ہوا تھا۔ قرآن کریم تخلیق انسانی کے اس دور کو ایک اور مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ
مَّسْنُوْنٍ ○ (الحجر-۲۶)

(اور ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے یعنی ایسے گارے سے
پیدا کیا جس کی حالت (مرور ایام سے) تبدیل ہو چکی تھی۔

یعنی انسان مٹی اور پانی کے ایسے آمیزے سے پیدا ہوا جس کی ہیئت میں ایک طویل مدت کے تخلیقی عمل سے گذرنے کی وجہ سے تبدیلی آچکی تھی۔ یہ تخلیقِ انسان کا پہلا دور تھا۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا جس کے بارے میں قرآن وضاحت کرتا ہے کہ:۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ
فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ○ (الدھر-۲)

(یعنی (پھر) ہم نے انسان کو ایک ایسے نطفے سے پیدا کیا جو مخلوط تھا
یعنی عورت اور مرد دونوں کے اشتراک سے پیدا کیا گیا تھا تاکہ ہم
اس کا امتحان لیں پس ہم نے اسے خوب سننے اور دیکھنے والا بنایا)

ایک اور مقام پر فرمایا:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ الخ (الاعراف-۱۱)

(یعنی پہلے ہم نے تمہیں پیدا کیا (مگر قابل ذکر صورت میں
نہیں) پھر تمہاری صورت گری کی۔ یعنی مناسب و موزوں
صورتیں دیں)

اب ان آیات پر غور کیجئے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ انسان تخلیق کے تین ادوار سے گذرا۔

پہلے وہ ایک نقطۂ حیات کے سوائے اور کچھ نہیں تھا جسے "LIFE CELL" کہا جاتا ہے۔ اس وقت وہ پانی میں تھا اور یہیں سے اس کی زندگی کا آغاز ہوا۔ اسی حالت کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا کہ ہم نے ہر چیز کو پانی میں زندگی دی اور انسان کی ابتدائے حیات کی یہی وہ کیفیت تھی جس کے بارے میں فرمایا کہ ابتدا میں انسان پر ایک ایسا دور گذرا جب اس کی حالت ناقابل ذکر تھی اور وہ بالکل بے حقیقت وجود تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا دور تھا۔

دوسرا دور وہ تھا جب انسانوں کے جرثومے یعنی اس کی زندگی کے CELL پانی میں سے نکل کر ایسے آمیزے میں تخلیق پانے لگے جو پانی اور مٹی سے تیار ہوا تھا

جسے قرآن کریم کی سورہ حجر میں ایسے گارے سے تعبیر کیا گیا ہے جس کی ماہیت تبدیل ہو چکی تھی۔ یہاں وہ جسمانی طور پر ارتقا پاتا رہا اور پھر جب جسمانی اعتبار سے مکمل انسان بن گیا تو پھر وہ حیات کے تیسرے دور میں داخل ہوا۔

اس دور کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے کہ (اس کے بعد) ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا یعنی جب اس کا جسم کامل ہو گیا تو پھر عورت اور مرد کے اختلاط سے حیات انسانی کی افزائش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی دور کے بارے میں وہ فرماتا ہے کہ ہم نے اسے رحم مادر میں مناسب و موزوں صورتیں بخشیں اور اسے بصارت و سماعت کی صلاحیتوں سے نوازا تاکہ وہ ہمارے کام کے قابل ہو جائے اور کائنات کو سنوارنے کا فریضہ ہم اس کے سپرد کر دیں۔ انسان کے اسی دور حیات کے بارے میں وہ فرماتا ہے کہ تاکہ ہم اس کی آزمائش کریں۔ گویا اب وہ ذہنی طور پر بھی مکمل ہو چکا تھا۔ (سورہ الدھر۔ ۲۰)

اس طرح خداوند تعالیٰ کا قرآن کریم کے آغاز میں یہ فرمانا ہمارے مشاہدے میں آ گیا کہ الحمد للہ رب العالمین ○ یعنی تمام تعریفوں کا مستحق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے ہر چیز کو (جس میں انسان بھی شامل ہے) اس کی ابتدائی حالت سے ترقی دے کر درجۂ کمال کو پہنچایا۔ اگر انسان ابتدا میں ناقابل ذکر حالت میں نہیں تھا۔ اگر وہ مختلف ادوار سے گذر کر موجودہ جسمانی حالت تک نہیں پہنچا۔ اگر اس نے ابتدا میں پانی اور پھر اس کے بعد پانی اور مٹی کے آمیزے میں جسے قرآن گارے سے تشبیہ دیتا ہے پرورش نہیں پائی تو ہمیں خود قرآن کی بیان کردہ صداقتوں کا انکار کرنا پڑے گا جن کی رو سے انسان کا جسم ارتقائی مراحل سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچا۔ پس ثابت ہوا کہ بڑا عظیم اور عظیم تر ہے قرآن حکیم جس نے پیدائش انسانی کی حقیقتوں سے پردے اٹھا دئے اور انسان کو تاریکی میں ٹھوکریں

کھانے سے بچا لیا۔

اگر کارلائل زندہ ہوتے تو ان سے دریافت کیا جاتا کہ تخلیق کائنات اور پیدائش انسانی کے بارے میں جو حقائق قرآن کریم نے بیان کئے ہیں کیا ان کا عشر عشیر بھی بائیبل نے بیان کیا؟ پھر کیسے کہا جائے گا کہ مسیحیت اسلام سے افضل ہے اور اسلام مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ واقعات تو اس کے برعکس ثابت کر رہے ہیں۔

تخلیق حوا کی بائیبلی داستان

بائیبل کہتی ہے کہ انسان کو تخلیق کرنے کے بعد خدا نے کہا کہ:۔

> "آدم کا اکیلا رہنا اچھا نہیں۔ میں اس کے لئے ایک مددگار اس کی مانند بناؤں گا۔۔۔۔۔"

پھر اس نے پرندے اور جانور تخلیق کئے مگر:

> "آدم کے لئے کوئی مددگار اس کی مانند نہ ملا ○ اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا ○ اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا" ○ (۴۱)

گویا بائیبل کی رو سے پہلے اللہ تعالیٰ نے زمین کی مٹی اور گرد و غبار جمع کیا، اسے گوندھا، پھر اس سے آدم کا پتلا تیار کیا، اس کی ناک میں دو سوراخ کئے، نتھنے بنائے پھر ان نتھنوں میں پھونک ماری اور اسے زندہ کیا۔ اس طرح وہ مٹی کا پتلا

---

(۴۱) کتاب پیدائش باب ۲۔ آیت ۲۱ تا ۲۳

"جیتی جان" ہو گیا۔ اس کے بعد اسے فکر ہوئی کہ یہ "جیتی جان" تنہا کیسے جئے گی تب اس نے انسان کا ساتھی تلاش کرنے کے لئے بہت سے جاندار تخلیق کئے مگر نعوذ باللہ اس کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور ان میں سے کوئی آدم کے لائق ثابت نہیں ہو سکا۔ آخر تھک ہار کر اس نے آدم ہی پر نیند طاری کر دی اور پھر اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور اس پسلی سے ایک ہیولیٰ تیار کیا' یہ ایک عورت تھی جسے آدم کے سپرد کر دیا کہ لے یہ تیری بیوی ہے' اسے انگریزی بائیبل میں "EVE" کا نام دیا گیا ہے۔ گویا یہ دنیا کی پہلی عورت تھی۔

یہاں بجا طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس مادے سے اللہ تعالیٰ نے آدم کا پتلا تیار کیا تھا کیا وہ اس سے "EVE" (حوا) کا پتلا تخلیق نہیں کر سکتا تھا۔ کیا وہ اتنی قلیل مقدار میں تھا کہ آدم کا پتلا تیار ہوتے ہی ختم ہو گیا اور کچھ بھی باقی نہ بچا کہ اس خالق کل کو آدم کی ایک پسلی نکالنی پڑی۔ کیا وہ پسلی زائد بن گئی تھی۔ پھر پسلی سے عورت کیسے بن گئی جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ارتقائی مراحل سے گذار کر تکمیل تک پہنچایا چنانچہ وہ خود فرماتا ہے کہ اس نے اس کائنات کو چھ دنوں یا چھ ادوار میں پیدا کیا۔ آخر ایک سیکنڈ میں سب کچھ کیوں نہیں پیدا کر دیا؟ بلاشبہ وہ اس پر قادر تھا' وہ ایسا کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ یہ اس کی سنت کے خلاف ہے۔ بچہ بھی ماں کے پیٹ میں نو ماہ تک ارتقائی مراحل سے گذرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے' اچانک اور مباشرت کے فوراً بعد کیوں پیدا نہیں ہو جاتا؟ پھر بی بی حوا پسلی سے پلک جھپکتے میں کیسے پیدا ہو گئیں؟ یہ سب ناقابل یقین اور خلاف عقل باتیں ہیں۔ اس قسم کی ساحری اور ایسے کرتب اللہ تعالیٰ کی شان قدوسیت کے خلاف ہیں۔

تخلیق حوا کا قرآنی نظریہ

آیئے دیکھیں کہ قرآن حضرت حوا کی تخلیق کے بارے میں کیا فرماتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات جو یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ قرآن انسان کی تخلیق کے بارے میں مرد اور عورت میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ وہ دونوں کی تخلیق کو ایک ہی طرح بیان کرتا ہے یعنی دونوں کو ایک ہی طرح تخلیق کیا گیا۔ دونوں کو ایک ہی مادے سے تخلیق کیا گیا۔ دونوں کو تخلیق کے ایک ہی عمل سے اور ایک ہی وقت میں گذرنا پڑا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ موجودہ بائیبل کی طرح قرآن میں بھی بیان فرماتا کہ ہم نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد پھر اس کی تنہائی دور کرنے کی غرض سے اس کی پسلی نکال کر اس سے ایک عورت بنائی اور کہا کہ لے یہ تیری بیوی ہے۔ آپ سارا قرآن پڑھ لیجئے آپ کو کسی ایک مقام پر ایسا بیان نہیں ملے گا بلکہ جہاں بھی انسان کی تخلیق کا بیان ہوا ہے وہاں مرد اور عورت دونوں مراد ہیں کیونکہ عورت بھی انسان ہے گویا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم انسان کو پیدا کریں گے یا بشر کو پیدا کریں گے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی یہ مراد ہرگز نہیں تھی کہ صرف مرد کو پیدا کریں گے بلکہ انسان کی جنس مراد تھی جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے آغاز ہی میں جب پہلی بار آدم کی پیدائش کا ذکر ہوتا ہے تو ساتھ ہی ان کی زوجہ کا ذکر بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الخ (البقرہ۔ ۳۵)

(اور ہم نے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو)

اگر آدم کی پیدائش اور ان کی زوجہ کی پیدائش میں وقفہ ہوتا' اگر دونوں کو الگ الگ ادوار میں پیدا کیا گیا ہوتا تو قرآن اس کا ذکر ضرور کرتا مگر دونوں کا اکٹھا ذکر کرنا ثابت کرتا ہے کہ آدم اور ان کی بیوی' عورت اور مرد دونوں کو ایک ہی دور میں اور ایک ہی طرح کے تخلیقی عمل سے پیدا کیا۔

قرآن میں عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کرنے کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔ قرآن

خدا کی وحی ہے اور خدا کی وحی میں بے سروپا باتیں نہیں ہوتیں۔ قرآن عورت کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے مگر وہ بہت سائیٹیفک طریقے سے کرتا ہے چنانچہ فرمایا کہ:۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا الخ (الزمر۔ ٦)

(ہم نے) تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور اس میں سے (یعنی اس کی جنس میں سے) اس کا جوڑا بنایا۔

دوسرے الفاظ میں تم سب کا نقطہء حیات (LIFE CELL) ایک ہی تھا مقصد یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک ہی جنس اور ایک ہی نوع کی دو شاخیں ہیں۔ دونوں کے جذبات و احساسات ایک ہی سے ہیں۔ دونوں کے ایک سے حقوق ہیں اور دونوں جوڑے کے محتاج ہیں اس کے بغیر ان کے وجود کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کی پسلی سے پیدا کیا ہے۔ پیدائش انسانی کا قانون اسی آیت میں چند الفاظ کے بعد آگے چل کر بیان کر دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ:۔

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ الخ (الزمر۔ ٦)

(اللہ تعالیٰ) تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے)

یہ خدا کا ازلی قانون ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ اس میں نہ تبدیلی ہوئی ہے، نہ ہو سکتی ہے، نہ اس سے آدم باہر ہیں نہ حوا باہر ہیں۔ فرمایا کہ تم کو ایک نفس (جان) سے پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ انسان، انسان کے نطفے سے پیدا ہوتا ہے، اسی نطفے میں عورت کا جرثومہ بھی ہوتا ہے۔ وہ کہیں باہر سے نہیں آتا۔

پسلی سے پیدا ہونے کا مطلب

قرآن کا قانون پیدائش تو یہ ہے۔ اس میں کوئی غیر طبعی اور غیر سائیٹیفک بات

نہیں۔ جہاں تک بائیبل میں عورت کے پسلی سے پیدا ہونے کا ذکر ہے دراصل یہ ایک استعارہ تھا جسے ظاہر پر محمول کر لیا گیا۔ اسرائیلیات کا یہ استعارہ اسلامی لٹریچر میں بھی در آیا اور ہمارے بعض مفسرین نے بھی لکھ دیا کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی۔ گویا جو چیز قرآن میں موجود نہیں وہ قرآن کی تفاسیر میں آ موجود ہوئی۔ دراصل یہ ایک حدیث مبارک ہے جس کا مفہوم یہ سمجھ لیا گیا کہ عورت کو واقعی آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا حالانکہ حضورؐ اقدس کے ارشاد گرامی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں، آپؐ فرماتے ہیں:

"عورت کو پسلی کی طرح ٹیڑھا پیدا کیا گیا ہے۔ اگر تو اسے قوت سے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ ٹوٹ جائے گی۔" (۴۲)

حضورؐ اقدس نے (عربی میں) لفظ "کالضلع" استعمال فرمایا یعنی پسلی کی طرح۔ "ضلع" پسلی کو کہتے ہیں۔ اس حدیث کے ذریعے حضورؐ اقدس نے عورت کی فطرت کا بہت ہی بصیرت افروز تجزیہ کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ عورت طبعاً" بہت نازک ہوتی ہے، اس کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے بہت ہی تدبر سے کام لینا چاہئے۔ جس طرح پسلی کو اگر زور اور قوت سے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ ٹوٹ جائے گی، اسی طرح عورت کو اپنا ہم خیال بنانے اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے حکمت عملی اور تدبر و فراست سے کام لینا چاہئے اور اس کی نفسیات کا خیال رکھنا چاہئے۔

عورت کو پسلی سے تشبیہ دینے کے ضمن میں ہم نے جو معنی حدیث مبارک کے بیان کئے ہیں ان کی تائید حضورؐ اقدس کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ یہ

---

(۴۲) صحیح بخاری الجزء السابع (جلد نمبر ۷) ص ۳۳ بمطعة مصطفی البابی الحلبی بمصر ۱۳۴۵ھ۔

حدیث امام مسلمؒ کی صحیح میں درج ہے اور تین طریقوں سے بیان کی گئی ہے لیکن مفہوم ایک ہی ہے، راوی اس حدیث کے حضرت انسؓ ہیں:

> "حضورؐ اقدس اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ سفر کر رہے تھے (یعنی اس سفر میں ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں) کہ اثنائے سفر میں "انجشہ" نامی ساربان نے جو بہت ہی خوش آواز تھا حدی خوانی شروع کر دی جس سے اونٹ (مست ہو کر) تیز تیز چلنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضورؐ اقدس نے فرمایا "اے انجشہ! تیری خرابی ہو شیشوں (مستورات) کو آہستہ آہستہ لے چل، انہیں توڑ نہ دینا۔" (۴۳)

اب ظاہر ہے کہ عورتیں شیشے کی بنی ہوئی تو نہیں ہوتیں، ان کے جسم شیشے کے تو نہیں ہوتے۔ حضور اقدس ﷺ نے عورتوں کی جسمانی اور طبعی نزاکت کے پیش نظر انہیں شیشے سے تشبیہ دی۔ یہی تشبیہ عورت کو پسلی سے دی گئی تھی۔ جس طرح عورت شیشے سے تخلیق نہیں ہوئی اسی طرح پسلی سے تخلیق نہیں ہوئی۔ یہ سب لطیف استعارے ہیں۔ جنہیں بائیبل کے کورذہن مرتبین نہیں سمجھ سکے۔

بائیبل کا مقام آدم

بائیبل کہتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد عدن کے ایک باغ میں رکھا اور فرمایا کہ اس درخت میں سے تم جس درخت کا چاہو پھل کھاؤ مگر فلاں درخت کا پھل نہ کھانا۔ بائیبل اسے نیک وبد کی پہچان کا درخت قرار دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا کہ جس دن تم نے اس درخت کا پھل

---

(۴۳) صحیح مسلم بشرح النووی جلد نمبر ۱۵۔ ص ۷۹، ۸۰ دار الفکر، بیروت (۱۳۹۲ھ - ۱۹۷۲م)

کھالیا اسی دن مر جاؤ گے۔ جب تک حضرت آدمؑ کی بیوی ان کے حبالۂ عقد میں نہیں آئیں اس وقت تک تو وہ اس "گناہ" سے محفوظ رہے مگر جب حضرت حوا تشریف لے آئیں تو سانپ نے انہیں ورغلایا اور حوا نے یہ پھل خود بھی کھالیا اور ترغیب دے کر آدم کو بھی کھلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ننگے ہو گئے (خلاصہ) (۴۴)

بائیبل کے اس بیان کی رو سے اللہ تعالیٰ نے جس درخت کا پھل کھانے سے حضرت آدم کو روکا تھا وہ "نیک وبد کی پہچان" کا درخت تھا۔ یعنی اس کا پھل کھانے کے بعد انہیں معلوم ہو جاتا کہ نیکی کیا ہے اور بدی کس چیز کا نام ہے۔ گویا وہ خیر و شر کے فلسفے سے پوری طرح باخبر ہو جاتے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں برائی کیا تھی بلکہ یہ تو بہت بڑی اور سب سے بڑی خوبی تھی۔ اسی مقصد کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تھا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو پیدا کرنا چاہا تھا جو قطعی بے شعور اور جاہلِ محض ہوتا، جس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ ہوتا؟ آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو کیوں پیدا کیا تھا؟ کیا تخلیق آدم کا بائیبل کوئی مقصد بیان کرتی ہے؟ قرآن تو ان کی پیدائش کا ایک واضح مقصد بیان کرتا ہے چنانچہ فرمایا کہ:۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ الخ

(الدھر۔ ۲)

(ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کو مکلف ٹھہرائیں یعنی اس پر ذمہ داریاں ڈالیں۔)

گویا قرآن آدم کی صورت میں ایک ایسی نسل کی پیدائش کا اعلان کرتا ہے جسے بہت ہی اہم ذمہ داریاں تفویض کی جائیں گی۔ دوسری جگہ اسے خلافت فی الارض

---

(۴۴) کتاب پیدائش باب ۲۔ آیت ۱۵

کا وارث قرار دیتا ہے سوچنے کی بات ہے کہ ایسا شخص جسے ساری دنیا کی امامت اور اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لئے پیدا کیا جا رہا ہے اگر اسے نیک و بد کی پہچان کا شعور بھی نہیں آئے گا تو وہ اپنے فرائض کیسے ادا کرے گا۔ اس لئے یہ بہت ہی مضحکہ خیز نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو آدم کو اپنا نائب اور دنیا پر امامت و قیادت کے لئے پیدا کیا اور دوسری طرف انہیں نیک و بد کی پہچان کرنے سے بھی روک دیا بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے تدبر اور اس کی فراست پر بھی حملہ ہے' اس سے بھی بڑھ کر اس کی صفتِ عدل کی توہین ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن جس آدم کا تصور پیش کرتا ہے وہ تو اس قدر باشعور انسان تھا کہ نیکی اور بدی کی باریک ترین راہیں اس کے سامنے روشن تھیں۔

بائیبل کا عورت پر ظلم

موجودہ بائیبل کہتی ہے کہ جب تک آدم تنہا زندگی گذار رہے تھے اس وقت تک انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور اس درخت کا پھل کھانے سے رکے رہے جس سے انہیں روکا گیا تھا مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرماتے ہوئے انہیں بی بی حوا بخش دیں تو جناب آدم نے اپنے رب کریم کو اس کے احسان کا بدلہ یہ دیا کہ بیوی کے بہکاوے میں آکر اس درخت کا پھل کھالیا جس کے کھانے کی ممانعت کی گئی تھی۔ گویا اگر حوا ان کی زوجیت میں نہ آتیں تو وہ یہ گناہ ہرگز نہ کرتے۔ اس طرح دنیا میں آج جتنی خرابیاں ہیں ان کی ذمہ دار حوا قرار پاتی ہیں۔ آیئے دیکھیں کیا قرآن نے بھی صنف نازک پر یہ ظلم کیا ہے اور ساری خرابیوں کا ذمہ دار عورت کو قرار دیا ہے؟ قرآن کریم تو فرماتا ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (اعراف۔ ۲۰)

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ (اعراف۔ ۲۲)

دونوں جگہ جمع کا صیغہ "لَهُمَا" استعمال کیا ہے یعنی شیطان نے دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔ دونوں کو فریب میں مبتلا کر کے ان کی کمزوریاں ان پر ظاہر کر دیں۔

گویا قرآن بائیبل کی طرح صرف عورت (حوا) کو ذمہ دار قرار نہیں دیتا بلکہ دونوں کو برابر کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور وہ یہ نہیں کہتا کہ حوا نے آدم کو بہکایا بلکہ قرآن کی رو سے دونوں کو شیطان نے بہکایا اور شیطان کا لفظ قرآن کریم میں کمزوری کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

پھر موجودہ بائیبل کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حوا کو ان کے جرم کی سزا دی اور یہ سزا اتنی سخت تھی کہ شیطان کو بھی نہ ملی ہو گی۔ بائیبل کا ارشاد ہے:۔

> "پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہو گی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا ○ اور آدم سے اس نے کہا چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا اس لئے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی"۔ (۴۵)

گویا اگر حوا آدم کو گمراہ نہ کرتیں تو ان کو دردِ زہ کی تکلیف سے نہ گزرنا پڑتا اور بچہ بغیر تکلیف کے پیدا ہو جاتا' نہ انہیں مرد کی محکومیت برداشت کرنی پڑتی۔ بائیبل نے حوا کے گناہ کی سزا کو صرف یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والی تمام عورتوں کو اس جان لیوا تکلیف میں مبتلا کر دیا حالانکہ جرم ----

---

(۴۵) کتاب پیدائش باب ۳۔ آیت ۱۶

اگر کوئی "جرم" تھا تو وہ حوا کا تھا، سزا تو صرف انہیں ملنی چاہئے تھی، ان کے بطن سے پیدا ہونے والی عورتوں کا کیا قصور تھا کہ وہ بھی ماں کے جرم کی سزا میں پکڑی گئیں اور قیامت تک کے لئے مردوں کی محکوم بنا دی گئیں۔ پھر حوا اور آدم کے جرم میں زمین کو بھی شریک کر لیا گیا اور اسے لعنتی بنا دیا گیا حالانکہ زمین کا تو کوئی قصور نہیں تھا، اس پر گناہ کا ارتکاب ضرور کیا گیا مگر وہ زمین نے تو نہیں کیا، اس نے تو نہیں کہا تھا کہ مجھ پر ارتکابِ گناہ کرو۔

غرض جس رخ سے دیکھئے موجودہ بائیبل غیر سائینٹیفک باتیں کرتی ہے، خلاف عقل کہانیاں سناتی ہے جبکہ قرآن اس قسم کی مضحکہ خیز داستانوں سے پاک ہے۔ وہ جرم و سزا کا نہایت پاک و صاف تصور پیش کرتا ہے، مطابق عقل فلسفہ بیان کرتا ہے جس کی رو سے ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا ملتی ہے دوسرے کے افعال کی سزا اسے نہیں دی جا سکتی، یہاں ایک نفس دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط (بنی اسرائیل۔ ۱۵)

(اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)

اس سے پہلے اسی آیت میں فرمایا:۔

"جو شخص راہ (مستقیم) پر چلتا ہے وہ اپنے نفع کے لئے راہ (مستقیم) کے لئے چلتا ہے اور جو شخص بے راہ ہو جاتا ہے سو وہ بھی اپنے نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے"۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۵)

گویا قرآن ہر فرد کو اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ وہ ایک کو دوسرے کے اعمال کی سزا میں پکڑنے کو درست قرار نہیں دیتا بلکہ سرے سے ایسا تصور ہی پیش نہیں کرتا۔ نہ وہ عورتوں اور مردوں میں اس قسم کی کوئی تفریق روا رکھتا ہے۔ قرآن

مرد و عورت دونوں کو صاحب ارادہ اور صاحب عمل قرار دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ آدم کا عمل آدم کے لئے ہے، حوا کا عمل حوا کے لئے ہے چنانچہ فرمایا:۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا ط وَ لِلنِّسَآءِ
نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ (النساء۔ ۳۲)

(مردوں کے اعمال کا حاصل ان کے لئے ہے اور عورتوں کے اعمال کا صلہ ان کے لئے ہے)

یعنی کوئی ایک دوسرے کے اعمال کے نتیجے میں شریک و حصہ دار نہیں ہو گا۔ جو مردوں نے کمایا وہ انہیں ملے گا اور جو عورتوں نے کمایا وہ انہیں ملے گا۔ نہ مردوں کے بیٹے اور عورتوں کی بیٹیاں اپنے باپوں اور اپنی ماؤں کے جرم میں پکڑی جائیں گی۔

جہاں تک آدم و حوا کے گناہ کا تعلق ہے قرآن اسے دانستہ گناہ قرار ہی نہیں دیتا بلکہ وہ تو اسے ان کی بھول قرار دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

وَ لَقَدْ عَہِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ
نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا ○ (طٰہٰ۔ ۱۱۵)

(اور اس سے قبل ہم نے آدم کو ایک امر کی تاکید کی تھی مگر اس سے بھول ہو گئی اور وہ ہماری تاکید کی عمداً خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتا تھا)

چونکہ حضرت آدم نے دیدہ و دانستہ اور ارادۃً سرکشی و نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا تھا اس لئے جب انہیں اپنی لغزش کا احساس ہوا تو وہ سخت نادم ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنی اس کوتاہی کی معافی مانگی۔ پھر کیا ہوا؟ قرآن فرماتا ہے کہ:۔

ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ وَ ہَدٰی ○ (طٰہٰ۔ ۱۲۲)

> (اس کے بعد اس کے رب نے اسے اپنے منتخب بندوں میں شامل کرلیا اور اسے راہ ہدایت پر قائم کردیا)

گویا قرآن نے یہ سارا قصہ ہی ختم کردیا' وہ کتاب ہی بند کردی جس میں موجودہ بائیبل حضرت آدم اور حضرت حوا کے گناہ کی تفاصیل بیان کر کے ان کی اولادوں تک کو ابدی سزایافتہ قرار دیتی ہے۔ قرآن نے تو فیصلہ کردیا کہ آدم اور حوا دونوں نے ارتکاب گناہ کا پختہ ارادہ ہرگز نہیں کیا تھا بلکہ ان سے سہو ہوگیا' بھول ہوگئی اس لئے اللہ نے انہیں معاف کردیا۔ جب انہی دونوں کو معاف کردیا گیا جن سے غفلت کی حالت میں گناہ سرزد ہوگیا تھا تو ان کی اولادیں ناکردہ گناہی میں کیوں پکڑی جاتیں؟ قرآن نازل کرنے والا خدا تو بہت ہی عادل ہے بلکہ عدل کا سرچشمہ ء حقیقی ہے۔

ہمیں بتایا جائے کہ عدل و انصاف 'معقولیت 'عفو و رحم 'حسن و احسان 'عظمت انسانیت اور عصمت انبیاء کا تصور اسلام پیش کرتا ہے یا مسیحیت؟ دونوں میں سے کون کس سے افضل ہے؟ اسلام مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا اسلام نے آکر بگڑی ہوئی مسیحیت کو سنوارنے کی سعی مشکور سرانجام دی۔ کاش کارلائل کو کوئی سمجھاتا۔

قرآن کی ترتیب

> "قرآن پر غور کیجئے آپ محسوس کریں گے کہ یہ آپ کی روح میں اترتا چلا جارہا ہے اور انکشاف حقائق کررہا ہے ---- قرآن کا سب سے بڑا وصف اور جوہر خلوص ہے۔ اس میں ایسی سچائی اور بصیرت جھلکتی ہے جسے شعری لطافت کے سوائے اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا ---- یوں محسوس ہوتا ہے کہ (آیات قرآنی) پہلے سے کسی سوچ بچار کے بغیر (پیغمبرؐ کے قلب پر) وارد ہورہی ہیں ---- انسان یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ قرآن میں حقائق کی ایسی جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں جو ایک بلند نظر مفکر ہی میں پائی جاتی ہیں۔ "کارلائل" (۱)

قرآن مجید کو بھرپور خراج تحسین پیش کرنے اور کلام الہٰی سے اس حد تک متاثر ہونے کے باوجود کارلائل اس پر معترض بھی ہوتا ہے۔ اسے قرآن کریم کی ترتیب پر اعتراض ہے' وہ کہتا ہے۔

> (حضرت) محمد ﷺ کے اصحاب کو قرآن بے ترتیب حالت میں ملا جو ہڈیوں پر تحریر کیا ہوا تھا انہوں نے زمانے اور سلسلے کے

---

(1) Heroes and Hero Worship, P-300

تقدم و تاخر کا خیال کئے بغیر اسے اگلی نسلوں کو منتقل کر دیا۔"

ہمارا خیال ہے کہ کارلائل کے سامنے قرآن مجید کے جمع و ترتیب کی تاریخ موجود نہ تھی ورنہ وہ یہ اعتراض کبھی نہ کرتا کہ قرآن بے ترتیب حالت میں تھا اور حضورؐ اقدس کے صحابہ نے اسی طرح شائع کر دیا۔ اس نے قرآن سے داخلی شہادت تلاش کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ورنہ اس کے قلم کو کبھی لغزش نہ ہوتی۔۔۔۔ اور پھر کارلائل یا دیگر غیر مسلم مفکرین ہی پر موقوف نہیں خود مسلمانوں میں بھی ایک ایسا طبقہ عہد رسالت کے بعد قریب قریب ہر دور میں موجود رہا اور آج بھی ہے جو کلام اللہ کو منجانب اللہ اور غیر محرف و غیر مبدل تسلیم کرنے کے باوجود اس کی ترتیب پر معترض رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موجودہ قرآن کی ترتیب وہ نہیں جس کے مطابق یہ حضورؐ اقدس پر نازل ہوا تھا۔

بلاشبہ جو قرآن حضورؐ اقدس کے زمانہ مبارک سے پڑھا جا رہا ہے اس کی ترتیب وہ ہرگز نہیں جس کے مطابق قلب پیغمبرؐ پر اس کا نزول ہوا تھا اور اس میں اعتراض کی ہرگز کوئی بات نہیں بلکہ اس کی یہی ترتیب اس کی بہت بڑی خوبی ہے جسے نہ کارلائل صاحب سمجھ سکے نہ ان کے ہم نوا مسلمان۔

حضورؐ اقدس کا طریقہ مبارک

پہلی بات یہ کہ قرآن کی مختلف آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئیں۔ بعض دفعہ کسی معترض کے اعتراض کے جواب میں، کبھی کوئی واقعہ رونما ہونے پر، کبھی کسی سائل کے سوال کے جواب میں، کبھی حضورؐ اقدس کی دعا کے جواب میں آیات قرآنی کا نزول ہوتا رہا۔ اگر یہ آیات اسی طرح ایک جگہ جمع کر دی جاتیں تو اس صورت میں بے ترتیبی کا الزام ضرور عائد ہوتا اور اس صورت میں یقیناً اس میں بے ربطی بھی پیدا ہو جاتی مگر حضورؐ اقدس کا طریق تو یہ تھا کہ جب آپؐ پر کوئی

آیت یا آیات نازل ہوتیں تو آپؐ کاتبانِ وحی میں سے کسی کو طلب کرتے اور ارشاد فرماتے کہ اس آیت کو فلاں سورت کے فلاں مقام پر لکھ دو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ۔

> "میں نے حضرت عثمانؓ بن عفان سے سنا وہ فرماتے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر آیاتِ قرآن کا نزول ہوتا تھا تو آپؐ کاتبانِ وحی میں سے کسی کو طلب کرتے اور فرماتے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں لکھ لو۔" (۲)

دوسری روایت میں ہے "فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھ لو۔" کاتبِ وحی کو حضورؐ اقدس کا ہدایت فرمانا کہ ۔۔۔۔ "اس آیت کو فلاں سورت میں اسی مضمون کی دوسری آیات کے ساتھ لکھ دو" ۔۔۔۔ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ آپؐ کے ذہن مبارک میں قرآن شریف کی ترتیب کا واضح اور مکمل خاکہ تھا۔ مضمون کا تسلسل آپؐ کے پیش نظر رہتا تھا اس لئے ہر مضمون کی آیات کو آپؐ اسی مضمون کی آیات کے ساتھ لکھواتے تاکہ بیان کا تسلسل قائم رہے اور مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات میں باہم ربط بھی موجود رہے۔

گویا اس روایت نے ثابت کر دیا کہ کارلائل کا یہ کہنا غلط ہے کہ "حضورؐ اقدس کے اصحاب کو قرآن کریم بے ترتیب اور غیر مربوط حالت میں ملا جسے ان حضرات نے اسی طرح آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیا"۔ شاید کوئی کہے کہ یہ روایت تو حضرت عثمانؓ کی ہے جن کی شخصیت پر خود مسلمانوں کا ایک فرقہ معترض ہوتا ہے۔

---

(۲) سنن ابی داؤد۔ الجزء الاول ص ۳۸۰ الطبعة الثانیه ۱۳۹۹ھ -- ۲۰۲ م طبع فی المطبعة العربیه۔ ۳۰ لیک روڈ لاہور پاکستان۔

ذیل میں ایسی آرا پیش کی جاتی ہیں جو اس طبقے کے معتبر ترین اکابر نے ظاہر کی ہیں یعنی اہلِ تشیع کے علماء اور مفسرینِ قرآن کی آراء۔

علمائے اہلِ تشیع کا مذہب

بعض ناواقف اہلِ تشیع نے غلط فہمی کا شکار ہو کر یہ نظریہ قائم کر لیا کہ قرآن حکیم میں بعض آیات ایسی تھیں جن سے حضرت علیؓ کی خلافت کی تائید ہوتی تھی اس بنا پر یہ آیات حضرات ابوبکرؓ و عثمانؓ نے قرآن شریف میں سے نکلوادیں، مگر خود اہل تشیع کے اکابر علما و مفسرین نے اس خیال کو لغو اور بیہودہ قرار دے کر رد کر دیا چنانچہ عہد حاضر کے ممتاز شیعہ عالم اور مجتہد علامہ سید علی نقی مرحوم نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے بڑی وضاحت سے لکھا کہ:

> "جب لڑائیوں میں حفاظِ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہو گئی اور خوف پیدا ہوا کہ کہیں حاملانِ قرآن کے قتل ہونے کے سبب قرآن کا کثیر حصہ تلف نہ ہو جائے تو اس وقت جمعِ قرآن کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس خدمت کو زیدؓ بن ثابت کے سپرد کیا گیا جو رسالت مآبؐ کے آخری زمانے کے صحابہ میں سے ایک فرد تھے۔ انہوں نے بڑی جاں فشانی و عرق ریزی کے ساتھ مختلف صحابہ کرام سے متفرق اجزا سے جو پتھر، چمڑے لیف خرما (کھجور کی چھال۔ مرتب) وغیرہ پر تھے نیز ان (حفاظ صحابہ۔ مرتب) سے دریافت کر کے ان کے محفوظات کی مدد سے قرآن مجید جمع کیا، اس میں یقیناً کوئی فروگذاشت اور کمی نہیں تھی سوا اس کے کہ وہ ترتیبِ نزول کے مطابق نہ تھا۔" (۳)

---

(۳) مقدمہ تفسیر القرآن، مولفہ مجتہد العصر مولانا سید علی نقی مرحوم ص۹۶ (ادارہ علمیہ پاکستان۔ لاہور)

مولانا علی نقی صاحب آگے چل کر پھر اہلِ تشیع کے مسلک و مذہب کی یوں تشریح کرتے ہیں۔

> "ہم نے بار بار اعلان کیا اور پھر اعلان کرتے ہیں کہ ہم اسی دونوں دفتیوں کے درمیان والے قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے کسی قسم کا شبہ نہیں رکھتے اور ہم اس کو کلام الہٰی، رسولؐ کا اعجاز، اسلام کی سچائی کا نشان اور تمام مسلمانوں کے لئے لازم العمل اور واجب الاتباع سمجھتے ہیں۔" (۴)

آگے چلئے زمانہ قدیم کے دو بڑے شیعہ مفسرینِ قرآن نے تو سینکڑوں سال قبل ہی اس سارے قضئے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ یہ اتنے بڑے عالم اور مفسر ہیں کہ ساری دنیائے شیعیت ان کے سامنے از روئے احترام سر تسلیم خم کرتی ہے۔ یہ ممتاز علما ہیں ---- علامہ الشیخ ابو علی طبرسی صاحبِ تفسیر "مجمع البیان" اور ملا محسن المعروف "فیض الکاشانی"۔ ذیل میں ان کا مسلک خود انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ (ترجمہ)

> "ہمارے ساتھیوں میں سے بعض لوگوں نے روایت کیا ہے کہ قرآن میں تغیر و تبدل کیا گیا ہے اور اس میں کمی کی گئی ہے (مگر) ہمارے اکابر کا یہ مذہب نہیں بلکہ اس کے برعکس ہے ---- قرآن تو اعجاز نبوت ہے اور تمام دینی احکام کا سرچشمہ، مسلمان علما نے اس کی حفاظت اس حد تک کی ہے کہ اس پر جو اعراب

---

(۴) مقدمہ تفسیر القرآن ص ۷۳ مولفہ مجتہد العصر مولانا سید علی نقی مرحوم

> لگائے گئے ہیں وہ، اور اس کی قراتوں اور اس کی آیات کے بارے میں جو اختلافی آرا ظاہر کی گئی ہیں ان سب پر عبور حاصل کرلیا ہے گویا کوئی امران کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہا، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر احتیاط، اس قدر نگرانی اور حفاظت کے اس قدر صحیح ترین انتظامات کے باوجود قرآن حکیم میں کوئی تغیرو تبدل ہوا ہو یا کوئی کمی ہوئی ہو۔" (۵)

گویا اہل تشیع کا ایک جید عالم اور مفسر قرآن اس کتاب مقدس کے بارے میں اپنے اکابر کا یہ مذہب بیان کر رہا ہے کہ قرآن کریم میں کسی نوعیت کا کوئی تغیرو تبدل نہیں ہوا۔ جس طرح یہ حضورؐ اقدس کے زمانہ مبارک میں تھا اسی طرح آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس طرح حضورؐ اقدس نے اسے ترتیب دیا تھا اسی ترتیب سے یہ آج بھی موجود ہے، تغیرو تبدل نہ ہونے کے یہی معنی ہیں۔

جامع قرآن خود حضورؐ اقدس ہیں

آگے چل کر یہی فاضل شیعہ مفسرِ قرآن غیر معمولی بصیرت سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے کہ۔

> "یہی قرآن رسول کریمؐ کے عہد مبارک میں ہی اسی صورت میں جمع ہو چکا تھا جس صورت میں آج موجود ہے۔ اس کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ یہی قرآن عہد رسالت میں پڑھا جاتا تھا اور حفظ کیا جاتا تھا، اصحاب رسولؐ کی ایک جماعت میں سے

---

(۵) "کتاب الصافی" فی تفسیر القرآن مولفہ محمد بن المرتضیٰ محسن المقلب فیض الکاشانی۔ الجزء الاول ص ۳۴۔۳۵ طبع چہارم "کتاب فروشی اسلامیہ" تہران (۱۳۹۳ قمری)

> بعض اصحاب جیسے عبداللہ بن مسعودؓ اور ابیؓ بن کعب نے کئی بار رسولؐ اقدس کے سامنے اسے ختم کیا۔ ان امور پر تھوڑا سا بھی غور و فکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن (حضورؐ اقدس کے زمانے میں ہی) مرتب ہو چکا تھا وہ بکھرا ہوا اور متفرق ہرگز نہیں تھا۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ فرقہ امامیہ میں سے جن لوگوں نے اس کی مخالف رائے ظاہر کی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ ان کی بنیاد کمزور حدیثوں پر ہے۔" (٦)

یہ فاضل شیعہ مفسرِ قرآن ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ قرآن شریف تو حضورؐ اقدس کے عہد مبارک میں جمع ہو چکا تھا۔ گویا جامع قرآن تو خود حضورؐ اقدس تھے۔ وہ کہتا ہے کہ رسولؐ اقدس کے جید صحابہ کی ایک جماعت نے آپؐ کے سامنے قرآن حکیم کا دور کیا اور ایک سے زیادہ بار اسے ختم کیا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن حضورؐ نے مرتب نہیں فرمایا، اگر وہ آپؐ کے عہد مبارک میں، آپؐ کی نگاہوں کے سامنے جمع و مرتب نہیں ہو گیا تھا تو اسے ختم کس طرح کیا جاتا تھا۔ آپؐ کے ان صحابہ کو کیسے معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کی کون سی آیت پہلے پڑھنی چاہئے اور کون سی بعد میں؟ اس کی کون سی سورت کی تلاوت پہلے کرنی چاہئے اور کون سی سورت کی تلاوت بعد میں؟ کون سی سورت کا مقام کون سا ہے؟ اور کس آیت کا مقام کون سا؟ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب

---

(٦) "کتاب الصافی" فی تفسیر القرآن مولفہ محمد بن المرتضیٰ محسن المقلب فیض الکاشانی۔ الجزء الاول ص ۳۴۔۳۵ طبع چہارم "کتاب فروشی اسلامیہ" تہران (۱۳۹۳ قمری)

قرآن مکمل صورت میں جمع ہو چکا ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن شریف کے موجودہ نسخے کی ترتیب حضورؐ اقدس کی ترتیب کے مطابق ہے۔

ہمارے استدلال سے اس گمراہ کن اعتراض کا بھی قلع قمع ہو جاتا ہے کہ قرآن جس ترتیب سے حضورؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوا تھا اسی ترتیب کے مطابق مرتب ہونا چاہئے تھا اور اسی ترتیب کے مطابق اس کی تلاوت کی جانی چاہئے تھی۔ اگر اس اعتراض کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کی زد تو اس پاک وجودؐ پر آتی ہے، جس کے قلب مبارک پر یہ نازل ہوا، جو اس کا سب سے پہلا حافظ و محافظ اور سب سے پہلا قاری تھا، جو سب سے بہتر جانتا تھا کہ اسے کس طرح مرتب کیا جانا چاہئے، جس کا کوئی فعل اور کوئی قول اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف نہ ہوتا تھا۔ جب خود اس پاک وجودؐ نے قرآن کی یہی ترتیب قائم فرمائی جس کے مطابق آج تک اس کی تلاوت ہو رہی ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ترتیب ارادہ ء الٰہی کے مطابق تھی ورنہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس سے روک دیتا اور فرما دیتا کہ اے میرے رسولؐ! قرآن کو اس ترتیب سے جمع کرو جس طرح ہم نے اسے تمہارے قلب پر نازل کیا مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایسی کوئی ہدایت نہیں فرمائی۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حضورؐ اقدس امت کو اس سے بے خبر رکھتے اور (نعوذ باللہ) قرآن کو غلط ترتیب کے مطابق مرتب کر کے اپنے رب کریم کے پاس چلے جاتے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن حضورؐ اقدس نے خود مرتب فرما دیا تھا تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمانؓ نے کیا کیا؟ اور انہیں جامع قرآن کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ اقدس نے قرآن کی ترتیب تو مقرر فرما دی تھی اور اسی ترتیب کے مطابق آپؐ اور آپؐ کے اصحابؓ اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے مگر قرآن حکیم اس وقت تک کسی ایک کتاب میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔ یہ الگ سورتوں کی شکل میں تھا اور مختلف کاتبانِ وحی کے پاس محفوظ تھا۔ ان میں سے ہر شخص کو معلوم تھا کہ قرآن کی پہلی سورت کون سی ہے اور آخری سورت کون سی؟ اور آیات کے مقامات کیا ہیں؟ اسی ترتیب سے ان کے پاس چمڑے، کاغذ، کھجور کی چھال اور اونٹ کے گھٹنے کی ہڈیوں وغیرہ پر یہ لکھا ہوا محفوظ تھا مگر ان سارے اجزا کو ایک کتاب کی صورت میں ایک جلد کے اندر جمع نہیں کیا گیا تھا۔

قرآن کو ایک جلد میں جمع کرنے کی فوری وجہ

چونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ قرآن کو کتابی صورت دی جائے گی، یہ ایک مکمل لکھی ہوئی کتاب کی صورت میں دنیا کے سامنے آئے گا، مسلمانوں کے گھروں، مساجد، درس گاہوں، لائبریریوں، حتیٰ کہ علم دوست غیر مسلموں کی میزوں پر اور ان کی الماریوں میں موجود ہو گا اس لئے اس کے اسباب بھی پیدا ہو گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

حضورؐ اقدس کے وصال کے بعد جب منکرینِ زکوۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کے فتنوں نے سر اٹھایا اور ان کی سرکوبی کے لئے خلیفہ رسول حضرت ابو بکرؓ صدیق کو مسلمانوں کے لشکر روانہ کرنے پڑے تو ان میں بڑے بڑے جید صحابہ شامل تھے، بکثرت حفاظ شامل تھے۔ ایسی ہی ایک جنگ مسیلمہ کذاب کے ساتھ یمامہ میں ہوئی۔ اس شدید جنگ میں کم و بیش سات سو صحابہ جو قرآن کے حافظ تھے شہید کر دیئے گئے۔ یہ واقعہ قرآن شریف کو ایک کتاب میں جمع کرنے کا باعث ہوا۔ چنانچہ حضورؐ اقدس کے محبوب صحابی [redacted] حضرت زیدؓ بن ثابت کا بیان ہے جو آپؐ کے بہت ہی مقرب کاتبِ وحی تھے۔

"جب یمامہ کی جنگ میں (بہت سے) مسلمان شہید کر دیئے گئے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مجھے طلب فرمایا۔ جب میں ان

کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے حضرت عمرؓ کو بھی ان کے پاس بیٹھے دیکھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ عمرؓ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ یمامہ کی جنگ میں قرآن کے بہت سے قاری (حفاظ) قتل کردیئے گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس طرح کی کچھ اور جنگوں میں باقی حفاظ بھی اگر قتل کردیئے گئے تو ایسا نہ ہو کہ قرآن کا بیشتر حصہ (جو ان کے سینوں میں محفوظ ہے) کہیں ضائع نہ ہو جائے اس لئے (اے ابوبکرؓ) آپ قرآن کو ایک جلد میں جمع کرنے کا حکم دیں۔ (حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ) میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسولؐ خدا نے نہیں کیا وہ تم کس طرح کرو گے؟ عمرؓ کا جواب تھا کہ (اگرچہ رسولؐ خدا نے قرآن کو ایک جلد میں جمع کرنے کا کام نہیں کیا مگر) خدا کی قسم یہ کام ہے بہت ہی خیر کا۔ اس کے بعد عمرؓ مجھے اس کام کی تحریک کرتے رہے یہاں تک اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی شرح صدر عطا فرمادیا اور میں بھی محسوس کرنے لگا کہ عمرؓ جس کام کی تلقین کر رہے ہیں وہ مناسب ہے پس میری رائے بھی وہی ہو گئی جو عمرؓ کی تھی۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ نے کہا کہ پھر ابوبکرؓ صدیق نے مجھے مخاطب کرتے ہوے فرمایا کہ (اے زیدؓ) تم مردِ خردمند ہو، جوان عمر ہو، ہمیں تم پر اعتماد و اعتبار ہے، تم رسولِ خداؐ کے زمانے میں وحی کی کتابت کیا کرتے تھے پس تم قرآن کے اجزا تلاش کر کے ایک جگہ جمع کرو۔

زیدؓ بن ثابت نے بیان کیا کہ حضرت ابوبکرؓ جو کام میرے

سپرد کر رہے تھے اس کے مقابلے میں پہاڑ کو اٹھا کر دوسری جگہ منتقل کر دینا میرے لئے کہیں آسان تھا۔ میں نے (ابوبکرؓ و عمرؓ سے) کہا کہ جو کام خود رسولؐ خدا نے نہیں کیا وہ آپ لوگ کیسے کریں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ اگرچہ رسولؐ خدا نے یہ کام نہیں کیا مگر خدا کی قسم اس میں خیر ہے۔ (حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ) وہ (حضرت ابوبکرؓ) اسی طرح مجھے تحریک کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ بھی اسی طرح کھول دیا جس طرح ابوبکرؓ و عمرؓ کے سینے کھول دیئے تھے اور میں قرآن حکیم جمع کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے لوگوں سے قرآن کے قلمی مسودات حاصل کرنے شروع کئے جو کھجور کی چھال، پتھروں کی پتلی سلوں اور لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھے۔ اس طرح میں قرآن جمع کرتا رہا یہاں تک کہ سورہ توبہ کی آخری آیت: لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم صرف ابو خزیمہؓ کے پاس سے دستیاب ہوئی۔" پھر یہ قلمی نسخہ قرآن حضرت ابوبکرؓ صدیق کی تحویل میں رہا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس آگیا، ان کی وفات کے بعد ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رہا" (۷)

---

(۷) صحیح البخاری۔ الجزء الرابع۔ ص ۱۹۰۷ مرتبہ الدکتور مصطفیٰ دیب البغا۔ دار ابن کثیر۔ دمشق و بیروت مطبوعہ ۱۴۱۰ھ۔ ۱۹۹۰م)

اس طرح حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ کی مساعی جمیلہ سے قرآن ایک جلد میں محفوظ ہو گیا۔ اب اس کا دوسرا مرحلہ تھا یعنی اسے کتابی صورت میں ساری دنیا تک پہنچانا۔ اس کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ کر چکا تھا اس لئے اس کے بھی غیب سے اسباب پیدا ہو گئے۔

قرآن کریم کی اشاعت کا آغاز

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اسلامی فوجیں آرمینیہ اور آذربائیجان کے علاقوں میں مصروف پیکار تھیں۔ اسلامی لشکر میں اہل حجاز کے دوش بدوش شام اور عراق کے نو مسلم بھی فوجی خدمات انجام دے رہے تھے۔ چونکہ یہ نو مسلم غیر قریش تھے اس لئے قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہوئے بعض اوقات تلفظ کی غلطیاں کر جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی خطرناک بات تھی اور اس سے قرآن کریم کی قرات بلکہ معنی میں بھی اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس صورت حال کو جن اصحاب رسولؐ نے بہت شدت سے محسوس کیا ان میں ایک محترم نام حضرت حذیفہؓ بن الیمان کا ہے۔ یہ بزرگ صحابی رسولؐ آرمینیہ اور آذربائی جان کے علاقوں میں اسلامی فوجوں کی معیت میں جنگ کر رہے تھے یہ زمانہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ حضرت حذیفہؓ بن الیمان محاذ جنگ سے واپس آئے اور حضرت عثمانؓ سے ملنے گئے۔ اس وقت حضرت انسؓ بن مالک بھی سیدنا عثمانؓ کے پاس موجود تھے۔ جناب انسؓ بیان کرتے ہیں کہ۔

> "حضرت حذیفہؓ نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ اے امیرالمومنین! قبل اس سے کہ مسلمان بھی قرآن کے بارے میں اسی طرح باہم اختلاف کرنے لگیں جس طرح یہود و نصاریٰ (اپنی آسمانی کتابوں کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں) آپ اس طرف توجہ فرمائیے۔ (اور کچھ کیجئے) تفصیل سن کر حضرت عثمانؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس قرآن حکیم کا جو نسخہ ہے وہ مجھے بھیج دیجئے، اس کی نقلیں کر کے آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔ حضرت حفصہؓ نے اپنا نسخہ حضرت عثمانؓ کو بھیج دیا۔ جناب عثمانؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعیدؓ بن العاص، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن حرث بن ہشام کو اس نسخے کی نقلیں تیار کرنے پر مامور کیا اور ہدایت فرمادی کہ اگر کسی لفظ کی قرات کے بارے میں تمہارے اور زیدؓ بن ثابت (جو انصاری تھے) کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو اس لفظ کو محاورہ قریش کے مطابق لکھنا کیونکہ قرآن شریف قریش کی زبان اور محاورے کے مطابق نازل ہوا ہے۔ ان چاروں کاتبانِ قرآن نے اسی طرح کیا۔ جب نقلیں تیار ہو گئیں تو حضرت عثمانؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کا نسخۂ قرآن تو انہیں واپس بھجوا دیا اور اس نسخے سے جو نقلیں تیار کی گئیں تھیں ان میں سے ایک ایک نقل سلطنت اسلامیہ کے مختلف صوبوں (کے گورنروں) کو ارسال کروا دیں۔ ان مصدقہ نسخوں کے علاوہ قرآن کریم کے جتنے اجزا لوگوں کے پاس موجود تھے وہ سب ان سے لے کر نذر آتش کروا دیئے (تاکہ قرآن کے بارے میں امت کے درمیان اختلاف و انتشار کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔) (۸)

---

(۸) صحیح البخاری، الجزء الرابع ص ۱۹۰۷۔ (دار ابن کثیر) بیروت ۱۴۱۰ھ ۔ ۱۹۹۰م

اس طرح حضرت عثمانؓ کی مساعی ء جمیلہ کی بدولت امت محمدیہ قیامت تک کے لئے ایک قرآن پر جمع ہو گئی اور اس کے بعد مسلمانوں میں قرآن کے کسی ایک لفظ کے بارے میں بھی کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔

اختلافِ قرات

مناسب ہو گا کہ یہاں تھوڑی سی وضاحت اختلافِ قرات کی کر دی جائے یعنی وہ کیا اختلاف تھا جس کی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کو صرف ایک قرات پر مرتب کروایا اور یہ کہ قرات سے کیا مراد ہے؟

قبائلِ عرب مختلف علاقوں میں آباد تھے اور بعض الفاظ کو اپنے اپنے لہجے کے مطابق ادا کرتے تھے۔ اگرچہ زبان ایک ہی تھی یعنی عربی مگر اس کے بعض الفاظ کا تلفظ ایک دوسرے سے مختلف تھا' جب قرآن نازل ہو رہا تھا اور حضورؐ اقدس اسے لکھوا رہے تھے تو آپؐ اسے قریش کے لہجے اور محاورے کے مطابق ہی لکھواتے تھے۔ جب غیر قریش مسلمان اسے لکھتے یا پڑھتے تھے تو وہ بعض الفاظ کا تلفظ اپنے محاورے اور لہجے کے مطابق ادا کرتے تھے چونکہ یہ لہجہ ان قبائل کا مادری لہجہ تھا اس لئے حضورؐ اقدس نے انہیں ان کے لہجے کے مطابق تلفظ ادا کرنے کی اجازت دے دی تھی تاکہ ابتدا ہی میں ان پر بوجھ نہ آپڑے مگر جب کچھ زمانہ گزر گیا اور قریش کا محاورہ اور لہجہ عام ہو گیا جس میں قرآن کی تلاوت کی جا رہی تھی تو اب اس اجازت کی ضرورت باقی نہ رہی۔ دوسری طرف غیر اقوام بہت تیزی سے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی تھیں خصوصاً جزیرہ نمائے عرب کے باہر آباد اقوام جب مشرف بہ اسلام ہونے لگیں تو بڑی مشکل پیدا ہوئی کیونکہ وہ قریش کی زبان اور اس کی باریکیوں سے واقف نہ تھیں اور جب قرآن کے ایک ہی لفظ کو ان کے سامنے مختلف لہجے میں پڑھا جاتا تو قدرتی بات ہے کہ ان کے ذہن میں الجھن پیدا ہوتی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ سارے قرآن کو صرف ایک قرات کے مطابق لکھا جائے تاکہ امت ہمیشہ کے لئے اختلاف سے محفوظ ہو جائے۔

قرات کے اختلاف سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اختلاف الفاظ یا جملوں کی ترتیب کا تھا بلکہ اس کی نوعیت بالکل مختلف اور بہت معمولی تھی اس کے دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

ایک لفظ ہے "حتیٰ" قریش مکہ اسے "حتیٰ" ہی پڑھا کرتے تھے مگر قبیلہ "ھذیل" کے لوگ اس لفظ کا تلفظ "حتیٰ" کی بجائے "عتی" کرتے تھے۔ گویا لفظ ایک ہی تھا' اس کے معنی بھی ایک ہی تھے مگر اسے ادا کرنے کا طرز یا حلق سے نکلنے والی آواز مختلف تھی لیکن حضورؐ اقدس نے اجازت دے دی تھی کہ جو لوگ اس لفظ کا تلفظ "حتیٰ" نہیں کر سکتے وہ "عتی" کر لیا کریں۔ مشہور صحابی رسولؐ اور قرآن کے بہت بڑے عالم اور مفسر حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ اس کا تلفظ "حتیٰ" کی بجائے "عتی" ہی کیا کرتے تھے اور لوگوں کو قرآن پڑھاتے وقت "عتی" ہی پڑھایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو جب معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس لفظ کی قرات قبیلہ ہذیل کے مطابق "عتی" کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے انہیں منع فرمایا اور کہا کہ اس لفظ کی وہی قرات کرنی چاہئے جو اہل قریش کے مطابق ہے یعنی "حتیٰ"۔

دوسرا لفظ "تابوت" تھا۔ اہل قریش یہ لفظ اسی طرح بولا کرتے تھے یعنی "تابوت" مگر بعض غیرِ قریش اسے "تابوہ" بولتے تھے۔ جب حضرت عثمانؓ کی ہدایت پر قرآن شریف کی نقلیں تیار کی جا رہی تھیں تو اس لفظ کی قرات پر بھی اختلاف ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ' سعیدؓ بن العاص اور عبدالرحمٰنؓ بن ہشام کا (جو قریش تھے) اصرار تھا کہ اس کا تلفظ "تابوت" ہے جبکہ حضرت زیدؓ بن ثابت جو انصاری تھے اس کا تلفظ "تابوہ" کرتے اور وہی لکھنا چاہتے تھے۔ آخر معاملہ

حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؓ نے فیصلہ فرمایا کہ۔

"اس لفظ کو "تابوت" لکھو کیونکہ قرآن قریش کی زبان (لہجے) میں نازل ہوا ہے (اور قریش اسے "تابوت" ہی بولتے ہیں) (۹)

ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اختلاف قرات کی کیا نوعیت تھی؟ گویا اختلاف قرآن کی آیات، ان کے الفاظ کے معنی یا ترتیب وغیرہ میں نہ تھا بلکہ اختلاف صرف لہجہ کا تھا جسے دور کرنا مقصود تھا اور وہ حضرت عثمانؓ کی کوششوں سے دور ہو گیا۔ اسی طرح قرآن کے جن اجزا کو نذر آتش کیا گیا وہ کسی مکمل قرآن کے نسخے نہیں تھے یہ دراصل مختلف سورتیں اور آیتیں تھیں جو لوگوں نے ہڈیوں، چمڑے، کھجور کے پتوں وغیرہ پر تحریر کر کے محفوظ کرلی تھیں۔ قرآن شریف کے یہی وہ اجزاء تھے جنہیں حضرت عثمانؓ نے نذر آتش کرنے کا حکم دیا تھا۔

حضرت علیؓ کی تائید

حضرت عثمانؓ کا یہ اقدام تنہا آپؓ کا ذاتی اقدام نہ تھا بلکہ مدینہ میں مقیم قابل ذکر صحابہ اس معاملے میں آپؓ کے مشیر و معین تھے جن میں ایک بڑا اور معتبر ترین نام سیدنا حضرت علیؓ بن ابی طالب کا ہے۔ چنانچہ جب حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کرلیا گیا اور آپؓ کے مخالفین نے آپؓ پر مختلف قسم کے الزامات لگائے تو ان میں ایک الزام یہ تھا کہ جنابِ عثمانؓ نے ایک کے سوائے باقی تمام قرآن (یعنی اس کے اجزاء) جلوا دیئے۔ اس الزام کا خود حضرت علیؓ نے جواب دیا تھا۔ یہ جواب حدیث کی نہایت معتبر کتاب "فتح الباری بشرح صحیح بخاری" میں موجود ہے۔

---

(۹) فتح الباری بشرح الصحیح البخاری جلد ۹ ص ۱۶ مولفہ قاضی حافظ ابی الفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد حجر العسقلانی۔ مطبوعہ الجامع الازھر (۱۳۴۸ھ)

"حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "لا تقولوا فی عثمان الا خیر"۔ یعنی عثمانؓ کی بابت سوائے اچھی بات کے اور کچھ نہ کہو کیونکہ قرآن کریم کے نسخوں کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ ہماری رائے اور مشوروں کے مطابق کیا۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے کہ بعض لوگ اپنی قرات کو دوسرے کی قرات سے بہتر قرار دیتے ہیں اور معاملہ کفر تک جا پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہم نے (حضرت) عثمانؓ سے پوچھا کہ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو ساری امت کو ایک ہی قرآن (صحیفے) پر جمع کرنا چاہتا ہوں تاکہ لوگوں کے درمیان اختلاف نہ رہے۔ (حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ) ہم نے کہا کہ آپ کی رائے بالکل درست ہے" (۱۰)

اس سے قبل جب سیدنا صدیقؓ اکبر نے قرآن شریف کے اجزا کو مختلف صحابہ سے حاصل کر کے ایک جلد میں جمع کروایا تو سیدنا علیؓ بن ابی طالب نے سیدنا ابوبکرؓ کے اس فعل کی بھی تائید فرمائی اور صدیق اکبر کے نسخے کو قرآن کا سب سے پہلا مجلد نسخہ قرار دیا۔ چنانچہ آپؓ فرماتے ہیں۔

"اعظم الناس فی المصاحف اجرا" ابوبکر رحمته اللہ علٰی ابی ابکر ھو اول من جمع

---

(۱۰) فتح الباری بشرح الصحیح البخاری جلد ۹ ص ۱۵۔ مطبوعہ جامع الازھر (۱۳۴۸ھ)

کتاب اللہ۔" (۱۱)

"جن لوگوں نے قرآن شریف جمع کیا ان میں سب سے عظیم شخص ابو بکرؓ ہیں جن پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کو (ایک جلد میں) جمع کیا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے جن اصحاب کو قرآن حکیم کی نقول کرنے پر مامور فرمایا تھا ان میں امیرالمؤمنین جناب علیؓ بن ابی طالب کا نام سرفہرست ہے۔

جمع قرآن میں انتہائی احتیاط

ان تصریحات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم کو ایک جلد میں جمع کرنے کا کام کتنی احتیاط اور تن دہی سے کیا گیا اور اس دور کے وہ تمام صحابہ جن کے پاس قرآن کریم کے اجزاء موجود تھے وہ سب حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے تھے۔ جب حضرت ابو بکرؓ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جن لوگوں کے پاس قرآن شریف کی آیات ہیں وہ لے آئیں تو اس اعلان پر قرآن کریم کے اجزاء کا انبار لگ گیا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت ایک ایک آیت اور ایک ایک سورت کو پڑھتے اور پھر اسے اس مقام پر رکھ لیتے جو حضورؐ نے مقرر فرمایا تھا۔ مزید تصدیق کے لئے حفاظ سے مدد لی جاتی تاکہ اگر کسی سے کوئی آیت تحریر کرنے میں کہیں ذرا سی بھی غلطی ہو گئی ہو تو یہ حفاظ اس کی تصحیح کر دیں جنہوں نے کلام الٰہی حضورؐ اقدس سے براہ راست سن کر اپنے سینوں میں محفوظ کیا تھا۔

---

(۱۱) "کتاب المصاحف" ابی داؤد ص ۱۰۔ طبع اول (مرتبہ آرتھر جیفرے و سرولیم میور) مطبعۃ الرحمانیہ مصر۔

تاریخ میں اس امر کی بھی صراحت موجود ہے کہ قرآن کو جمع کرتے وقت نہ تو صرف تحریر پر اعتماد کیا گیا نہ مجرد حافظے پر بلکہ دونوں سے کام لیا گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کا حکم تھا کہ محض کسی سے کوئی آیت سن کر قرآن کے اس نسخے میں داخل نہ کی جائے بلکہ دیکھا جائے کہ وہ کسی کے پاس لکھی ہوئی بھی موجود ہے چنانچہ ایک بہت بڑا شارح حدیث بیان کرتا ہے کہ۔

> "حضرت ابو بکرؓ کسی ایسی چیز (آیت) کو مصحف میں شامل کرنے
> کی اجازت نہیں دیتے تھے جو لکھی ہوئی نہ ہو۔" (۱۲)

کیا روئے زمین پر آج کوئی ایک بھی ایسا صحیفہ آسمانی موجود ہے جس کے جمع و ترتیب اور تحریر میں اس درجہ احتیاط سے کام لیا گیا ہو، جس کی اس قدر حفاظت کی گئی ہو اور جسے من و عن اسی طرح تحریر میں لایا گیا ہو جس طرح پیغمبرؐ کی زبان سے نکلا تھا۔ آج دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا صحیفہ آسمانی موجود نہیں جس کے راویوں کا نام کسی کو معلوم ہو، جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ یہ کس زمانے میں لکھا گیا، کن لوگوں نے لکھا، کس سے سن کر لکھا اور اس کے لکھنے میں کن شرائط اور کس قسم کی احتیاطوں کو کام میں لایا گیا۔ یہ شرف و سعادت دنیا کے سارے آسمانی صحائف میں صرف قرآن کریم کو حاصل ہے کہ اسے سب سے پہلے تحریر میں لانے والے شخص کا نام تاریخ میں محفوظ ہے یعنی حضرت زیدؓ۔ ان کے مکمل حالات زندگی موجود ہیں، جس شخصیت نے اس کے جمع کرنے کا حکم دیا یعنی حضرت ابو بکرؓ صدیق، جس نے اس کام کی سب سے پہلے تحریک کی یعنی حضرت عمرؓ فاروق، پھر جس شخصیت نے اس مستند ترین نسخے کی نقول کروا کر مملکت اسلامیہ میں بھجوائیں یعنی حضرت عثمانؓ

---

(۱۲) فتح الباری بشرح الصحیح البخاری جلد ۹ ص ۱۰۔ ابن حجر العسقلانی مطبوعہ الجامع الازھر (۱۳۴۸ھ)

اور جن لوگوں نے اس کی نقول تیار کیں یعنی حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن عباس، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت انسؓ بن عبدالمالک، حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت عبداللہؓ بن زبیر، حضرت سعیدؓ بن العاص اور حضرت عبدالرحمنؓ بن حرث بن ہشام ۔۔۔۔ ان میں سے ایک ایک کا نام تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔ یہ کون اور کس مرتبے کے لوگ تھے؟ اس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے کیونکہ ان میں سے کوئی مجہول الحال نہ تھا بلکہ یہ سب حد درجہ معروف لوگ تھے جن میں سے ہر شخص کے سر پر شہرت و ناموری کا تاج مزین ہے۔ لاریب کہ آج دنیا میں کوئی ایک آسمانی کتاب ایسی موجود نہیں جس کے منجانب اللہ ہونے اور جس کی صحت کے بارے میں اتنا یقین حاصل ہو جتنا قرآن کریم کے بارے میں حاصل ہے۔

حضورؐ اقدس کی ترتیبِ قرآن

کارلائل کا اعتراض ہے کہ "قرآن آنحضرتؐ کے صحابہ کو بے ترتیب حالت میں ملا اور انہوں نے اسی طرح جمع کر کے اسے اگلی نسلوں کو منتقل کر دیا۔"

یہ اعتراض محض ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن تو خود حضورؐ اقدس نے اپنی زندگی میں مرتب فرما دیا تھا۔ سورتوں کے نام، ہر سورت میں آیات کی تعداد، ہر آیت کا مقام اور قرآن کی منزلیں یہ سب حضورؐ کی ہدایت کے مطابق مقرر ہو چکی تھیں تاریخ میں اس کی پوری تصریح موجود ہے چنانچہ ایک صحابی رسولؐ حضرت اوسؓ بن عوف کا واقعہ ہے کہ وہ بنی ثقیف کے اس وفد کے ساتھ حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے جو مشرف با اسلام ہونے کے لئے آیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ:

> "رسول اللہؐ نے فرمایا (مجھے پیغام بھیجا) کہ ابھی مجھے قرآن کا "حزب" (منزل) ختم کرنی ہے جب تک اسے ختم نہ کر لوں

> اس وقت تک باہر نہ آؤں گا۔ دوسرے دن صبح کو میں نے رسول اللہؐ کے ساتھیوں (صحابہ) سے دریافت کیا کہ (یہ منزل کیا ہے یعنی) قرآن کی تقسیم کس طرح کی گئی ہے (یا اسے کتنے حصوں میں تقسیم کیا گیا) صحابہ رسولؐ نے جواب دیا کہ قرآن شریف کو سورتوں کی شکل میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی ایک منزل میں تین سورتیں ہیں، کہیں پانچ، کہیں سات، کہیں نو، بعض جگہ گیارہ اور بعض جگہ تیرہ سورتیں ہیں۔ ان میں سے سورتوں کے ہر مجموعے کا نام "حزب" (منزل) ہے۔ سورہ "ق" سے لے کر قرآن کی آخری سورت تک جسے مفصل کا نام دیا جاتا ہے" (آخری منزل ہے) (خلاصہ) (۱۳)

یہ واقعہ حضورؐ اقدس کے زمانہ مبارک کا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں قرآن شریف کی مکمل ترتیب مقرر فرما دی تھی، اس کی سورتوں کے نام مقرر فرما دیئے تھے، ان تمام سورتوں کو سات حصوں میں تقسیم فرما دیا تھا، ہر حصے کا نام "حزب" (منزل) تجویز فرمایا تھا، ہر منزل میں سورتوں کی تعداد کا تعین فرما دیا تھا اور حضورؐ اقدس کی دی ہوئی اسی ترتیب کے مطابق آج تک قرآن لکھا جاتا، طبع ہوتا اور پڑھا جاتا ہے اس میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔ آج بھی

---

(۱۳) مسند احمد بن حنبلؒ جلد ۴ ص ۹ و ص ۳۴۲ المطبعۃالمیمینہ مصر (۱۳۱۳ھ) یہ روایت ابن ماجہ کتاب الاقامہ حدیث نمبر ۱۷ اور سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۹ باب شہر رمضان کے تحت بھی درج ہے۔ یہ روایت مجھے نہیں مل رہی تھی، میرے دوست ڈاکٹر سید خورشید الحسن رضوی وزٹنگ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کے تعاون سے حاصل ہوئی، میں ان کا ممنون ہوں۔ (پیام)

قرآن حکیم کی سات ہی منزلیں ہیں۔ ابو بکرؓ صدیق نے جو نسخہ مرتب کروایا تھا اور جسے حضرت زیدؓ بن ثابت نے مرتب (جمع) کیا تھا اس میں بھی قرآن کریم کی سات ہی منزلیں تھیں جو آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔ یہی ترتیب حضرت اوسؓ بن عوف کے سامنے صحابہ رسولؐ نے بیان کی تھی۔

پھر صحابہ رسولؐ نے جناب اوسؓ کو بتایا تھا کہ رسول اللہؐ نے قرآن کی سورتوں کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ پہلی منزل میں (سورہ فاتحہ کو چھوڑ کر) تین سورتیں ہیں یعنی بقرہ، آل عمران، نساء۔ حضرت ابو بکرؓ کی نگرانی میں جو قرآن جمع کیا گیا تھا اس میں بھی سورتوں کی ترتیب اسی طرح تھی اور آج تک اسی طرح برقرار ہے۔

صحابہ رسولؐ نے جناب اوسؓ کو بتایا تھا کہ دوسری منزل میں پانچ سورتیں ہیں اور حضرت ابو بکرؓ نے قرآن کا جو نسخہ حضرت زیدؓ کے ذریعے مرتب کروایا (یعنی جمع کروایا) تھا اس میں بھی یہ پانچ سورتیں تھیں یعنی سورہ مائدہ، سورہ انعام، سورہ اعراف، سورہ انفال اور سورہ توبہ۔ یہی پانچ سورتیں آج بھی قرآن حکیم میں اسی ترتیب سے موجود ہیں۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جناب اوسؓ کو اصحاب رسولؐ نے بتایا تھا کہ قرآن کریم کی تیسری منزل میں سات سورتیں ہیں۔ یعنی سورہ یونس، سورہ ھود، سورہ یوسف، سورہ رعد، سورہ ابراہیم، سورہ حجر اور سورہ نحل۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ صدیق کی نگرانی میں، قرآن کا جو نسخہ مرتب کیا گیا تھا اس میں اتنی ہی سورتیں اسی ترتیب کے ساتھ تھیں اور آج تک تیسری منزل میں اتنی ہی سورتیں اسی ترتیب سے پڑھی جا رہی ہیں۔

صحابہ رسولؐ نے جناب اوسؓ کے سامنے قرآن شریف کی چوتھی منزل میں جن سورتوں کی نشاندہی کی تھی ان کی تعداد نو بتائی تھی یعنی سورہ بنی اسرائیل، سورہ کہف، سورہ مریم، سورہ طٰہٰ، سورہ انبیاء، سورہ حج، سورہ مومنون، سورہ نور، سورہ فرقان ـــــ اور سیدنا ابو بکرؓ صدیق کی نگرانی میں حضرت زیدؓ نے قرآن شریف کا جو نسخہ رسولؐ اقدس کی ترتیب کے مطابق ترتیب دیا تھا اس میں بھی چوتھی منزل میں یہی سورتیں شامل تھیں اور آج تک یہی شامل ہیں۔

پھر جناب اوسؓ کو صحابہ رسولؐ نے پانچویں منزل کی تفصیل بتاتے ہوئے اس میں شامل سورتوں کی تعداد ۱۱ بتائی تھی یعنی سورہ شعرا، سورہ نمل، سورہ قصص، سورہ عنکبوت، سورہ روم، سورہ لقمان، سورہ سجدہ، سورہ احزاب، سورہ سبا، سورہ فاطر، سورہ یٰسں اور یہی گیارہ سورتیں مصحف ابو بکرؓ میں تھیں جسے جناب زیدؓ نے حضورؐ اقدس کی ترتیب کے مطابق جمع و مرتب کیا تھا اور آج تک اس پانچویں منزل کی سورتوں کی یہی ترتیب اور یہی تعداد اسی طرح موجود ہے۔

جناب اوسؓ کو صحابہ رسولؐ نے چھٹی منزل کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اس منزل میں تیرہ سورتیں ہیں یعنی سورہ صافات، سورہ ص، سورہ زمر، سورہ مومن، سورہ حم السجدہ، سورہ شوریٰ، سورہ زخرف، سورہ فرقان، سورہ جاثیہ، سورہ احقاف، سورہ محمدؐ، سورہ فتح، سورہ حجرات، سورہ ق، اور یہی ۱۳ سورتیں اس مصحف میں شامل ہیں جو جناب زیدؓ نے حضورؐ اقدس کی مقررہ ترتیب کے مطابق سیدنا ابو بکرؓ صدیق کی نگرانی میں مرتب کیا تھا اور آج تک اس چھٹی منزل میں سورتوں کی تعداد اور ترتیب یہی ہے۔

اب رہ گئی قرآن شریف کی ساتویں اور آخری منزل جس میں شامل سورتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے حضورؐ اقدس کے صحابہ نے جناب اوسؓ کو بتایا تھا کہ سورہ ق سے لے کر آخری سورت تک باقی ساری سورتیں اس منزل میں شامل ہیں جن

میں وہ سورہ مبارکہ بھی ہے جو حضورؐ اقدس پر غار حرا میں سب سے پہلے نازل ہوئی تھی یعنی اقرا باسم ربک الذی خلق (الخ) اور اس میں کیا شک ہے کہ جناب زیدؓ کے مرتب کردہ مصحف صدیقیؓ میں آخری منزل سورت ق سے ہی شروع ہوتی ہے اور آخری سورت "والناس" پر قرآن ختم ہو جاتا ہے۔

کیا اب بھی کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ قرآن کی یا جناب ابوبکرؓ کی نگرانی میں ترتیب پانے والے قرآن کی وہ ترتیب نہیں ہے جس کے مطابق حضورؐ اقدس نے اسے ترتیب دیا تھا؟ حقائق شہادت دے رہے ہیں کہ جس ترتیب سے اسے حضورؐ اقدس نے مرتب کروایا تھا اسے جتنی منزلوں (حصوں) اور جتنی سورتوں میں تقسیم کیا تھا اور جس آیت کو جس مقام پر رکھا تھا اسی ترتیب سے جناب ابوبکرؓ نے مرتب کروایا اور اسی ترتیب کے مطابق یہ آج تک موجود ہے۔ اس طرح کارلائل کا یہ اعتراض باطل ٹھہرا کہ (حضرت) محمدؐ کے ساتھیوں (صحابہؓ) کو قرآن بے ترتیب حالت میں ملا تھا اور انہوں نے اسی بے ترتیب حالت میں اسے اگلی نسلوں کو منتقل کر دیا۔

آخر میں ہم ایک اور دلیل اس دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ حضورؐ اقدس قرآن کو بے ترتیب حالت میں چھوڑ کر دنیا سے تشریف نہیں لے گئے بلکہ بسم اللہ کی با سے لے کر والناس کی س تک اس کا ایک ایک لفظ' ایک ایک آیت اور ایک ایک سورۃ حضورؐ اقدس کی ہدایت اور نگرانی میں لکھی گئی اور اسی ترتیب سے آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ اس کا ورد کرتے تھے چنانچہ حضرت امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں ایک حدیث درج کی ہے جس کی رو سے حضورؐ اقدس نے فرمایا کہ۔

"جو شخص رات کو سورہ بقرہ کی دو آخری آیات تلاوت کرلے

گا تو یہ اس کے لئے کفایت کریں گی" (۱۴)

اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضورؐ اقدس نے سورتوں اور آیات کی تقسیم فرما دی تھی' سورتوں کے نام بھی تجویز فرما دیئے تھے اور آیات کی تعداد اور ترتیب کا بھی تعین فرما دیا تھا۔ اگر ایسا نہیں تھا' اگر کسی سورت کا کوئی نام نہیں تھا' اگر اس کا کوئی مقام نہیں تھا' اگر اس کی آیات میں ترتیب نہیں تھی تو پھر حضورؐ اقدس کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ۔

"سورہ بقر کی آخری ۲ آیات کفایت کریں گی"۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ اقدس نے سورتوں کا نام تجویز فرمانے کے بعد آیت کا مقام بھی متعین فرما دیا تھا کہ کون سی آیت کہاں درج ہونی چاہئے۔ کون سی آیت پہلے' کون سی درمیان میں اور کون سی آخر میں ہے' اگر ایسا نہیں تو پڑھنے والے کو کیسے پتہ لگ سکتا ہے کہ کس سورت کی آخری آیتیں کون سی ہیں۔

ایک اور بڑی مضبوط روایت اس دعوے کی تائید کرتی ہے کہ حضورؐ اقدس نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی قرآن شریف کی آیات اور سورتوں کی ترتیب مقرر فرما دی تھی اور آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ اسی ترتیب سے اس کا دور مکمل کرتے تھے چنانچہ ایک بہت بڑا محدث اپنی کتابِ حدیث میں بیان کرتا ہے کہ۔

> "حضرت عبداللہؓ بن عمرو نے حضورؐ اقدس سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں قرآن کتنی مدت میں ختم کر لیا کروں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ایک ماہ میں۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں اس سے کم مدت میں ختم کر سکتا ہوں۔ حضورؐ اقدس نے فرمایا کہ پچیس دنوں میں ختم کر لیا کرو۔ عبداللہؓ بن

---

(۱۴) صحیح مسلم (مشکول) الجزء الثانی۔ ص ۱۹۸۔ مطبوعہ الازہر مصر۔

> عمرو نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی کم مدت میں ختم کر سکتا ہوں۔ حضورؐ اقدس نے فرمایا (اچھا) بیس دنوں میں ختم کر لیا کرو۔ انہوں نے عرض کیا کہ (اے اللہ کے رسولؐ) میں تو اس سے بھی کم مدت میں ختم کر سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا اچھا پندرہ دن میں ختم کر لیا کرو۔ انہوں نے عرض کیا کہ (اے اللہ کے رسولؐ!) میں اس سے بھی کم مدت میں ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا کہ اچھا پھر دس دن میں ختم کر لیا کرو۔ اس پر انہوں نے عرض کیا کہ (یا رسولؐ اللہ !) میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ حضورؐ اقدس نے فرمایا کہ اچھا پھر پانچ دن میں ختم کر لیا کرو۔ اس پر عبداللہؓ بن عمرو نے عرض کیا کہ (یا رسولؐ اللہ) میں تو اس سے بھی کم دنوں میں ختم کر سکتا ہوں۔ ابن عمروؓ کا بیان ہے کہ آنحضورؐ نے مجھے اس سے کم مدت میں قرآن ختم کرنے کی اجازت نہیں دی ۔۔۔۔ آگے چل کر حضرت عبداللہؓ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے مزید فرمایا کہ جو شخص تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کرے گا وہ اسے سمجھ نہیں سکے گا۔" (۱۵)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن شریف حضورؐ اقدس کی ہدایت کے مطابق ترتیب نہیں پا گیا تھا اور اگر اس کی ترتیب ایک ہی نہیں تھی تو آپؐ کی یہ

---

(۱۵) الجامع الصحیح سنن ترمذی الجزاء الخامس ص ۱۹۶ مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر (۱۳۸۵ھ - ۱۹۶۵ء)

ہدایت کیا معنی رکھتی ہے کہ قرآن شریف کو پانچ دنوں میں ورنہ کم سے کم تین دن میں ختم کیا کرو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ روایت بالکل درست ہے کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ کاتبانِ وحی کو بلوا کر فرماتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں آیت کے ساتھ لکھ لو' کاتبان وحی اسی طرح لکھ لیتے اور صحابہ کے درمیان اس کی تشہیر ہو جاتی تھی کیونکہ صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت آپؐ کے قریب موجود رہتی تھی اور بعض لوگوں خصوصاً" اصحاب صفہ نے تو خود کو حضورؐ اقدس سے دین سیکھنے کے لئے وقف کر دیا تھا جو ہمہ وقت مسجد نبوی میں موجود رہتے اور جب کوئی تازہ آیت حضورؐ اقدس پر نازل ہوتی اسے اپنی کتابِ دل میں محفوظ کر لیتے۔ اس طرح حضورؐ اقدس پر نازل ہونے والی ہر آیت اور اس کا مقامِ ترتیب انہیں معلوم تھا۔ جید اور ممتاز صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ بن ابی طالب کا تو یہ ارشاد تاریخ میں محفوظ ہے کہ "قرآن کے بارے میں جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو کیونکہ کوئی آیت ایسی نہیں جس کا مقامِ نزول مجھے معلوم نہ ہو"۔ اسی طرح دوسرے ممتاز صحابی رسولؐ سیدنا حضرت عمرؓ بن خطاب کے بارے میں ایک بہت بڑے محدث نے لکھا ہے۔

> "حضرت عمرؓ کے ایک انصاری بھائی (عتبانؓ بن مالک) تھے جو حضرت عمرؓ کے پڑوسی تھے اور مدینہ کے ایک محلے "بنی امیہ بن زید" میں رہتے تھے' یہ محلّہ شہر کی بلندی پر واقع تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کے ساتھ مل کر یہ انتظام کر لیا تھا کہ دونوں باری باری حضورؐ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا کریں گے (یا حاضر رہا کریں گے) یعنی ایک دن حضرت عمرؓ خدمت اقدس میں حاضر رہتے اور اس روز اگر آپؐ پر آیات نازل ہوتیں تو اپنے غیر حاضر انصاری بھائی (عتبانؓ بن مالک) کو سنا دیتے اور جس

> روز حضرت عمرؓ غیر حاضر ہوتے اس روز اگر حضورؐ اقدس پر آیات نازل ہوتیں تو آپؓ کے انصاری بھائی یہ تازہ وحی حضرت عمرؓ کو سنا دیتے۔" (۱۶)

اس طرح حضورؐ اقدس پر نازل ہونے والی ہر آیت اور اس کا مقامِ ترتیب صحابہ رسولؐ کو معلوم ہو جاتا، وہ دوسروں کو بتاتے اور دوسرے اپنے علاوہ دوسروں کو بتاتے یوں ہوتے ہوتے قرآن شریف قریب قریب سارے صحابہؓ تک مع اپنی ترتیب کے پہنچ جاتا اور ان کے سینوں میں محفوظ ہو جاتا پھر وہ سینوں سے کھجور کی شاخوں، چمڑے اور ہڈیوں وغیرہ پر منتقل کر لیتے۔

سنہ ۹ھ تک قریباً" قرآن نازل ہو چکا تھا

شاید کوئی کہے کہ ابھی جب کہ قرآن مکمل طور پر نازل ہی نہیں ہوا تھا تو اس کے ختم کرنے کی مدت مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی بلکہ سرے سے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ابھی تو (مثلاً" ابتدائی یا درمیانی مدت میں) اس کی چند یا اس سے کچھ زیادہ سورتیں ہی نازل ہوئی تھیں۔

اگر غور کیا جائے تو اس اعتراض میں قطعاً" وزن نہیں ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی بھی کتاب کو ختم کرتے ہوئے ذہن پر بوجھ اس وقت ہی ہوتا ہے جب اس کا حجم زیادہ ہو اور اس کے پڑھنے پر وقت بھی بہت زیادہ صرف ہوتا ہو لیکن اگر کسی کتاب کے چند ہی اوراق ہوں تو اس کے ختم کرنے پر کون پابندی لگائے گا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ اتنی مدت میں ختم کرو ورنہ بہت وقت صرف ہوگا اور تھک جاؤ گے'

---

(۱۶) صحیح بخاری الجزاء الاول۔ ص ۲۲ مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی۔ مصر (۱۳۷۲ھ - ۱۹۵۳م)

ایسی پابندی تو خلافِ عقل ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب قرآن قریب قریب مکمل طور پر نازل ہو چکا تھا۔ اس کی ضخامت بہت زیادہ ہو چکی تھی جسے ایک یا دو راتوں میں ختم کرنا بہت مشکل، صبر آزما اور سخت محنت طلب کام تھا اور سمجھ کر پڑھنا تو بہت ہی مشکل تھا جو اس کی تلاوت کا اصل مقصد تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ رمضان سنہ ۹ ھ کا واقعہ ہے جب قبیلہ ثقیف کا وفد حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں قبول اسلام کیلئے حاضر ہوا تھا۔ (۱۷)

اس وفد کے ایک رکن حضرت اوسؓ کے دریافت کرنے پر صحابہ رسولؐ نے انہیں بتایا تھا کہ قرآن کی اتنی منزلیں ہیں اور ہر منزل میں اتنی اتنی سورتیں ہیں۔

گویا سنہ ۹ ھ تک سوائے ایک چھوٹی سی سورت اور ایک مختصر سی آیت کے سارا قرآن نازل ہو چکا تھا اور حضورؐ اقدس صحابہ کو اس کی ترتیب سے آگاہ فرما چکے تھے کہ کون سی سورت کا کون سا مقام ہے اور کون سی آیت کس سورت میں کس آیت کے ساتھ درج ہونی چاہئے۔ چونکہ قرآن شریف ضخیم ہو چکا تھا جس کا ختم ہونا ایک یا دو راتوں میں بہت مشکل تھا اس لئے حضورؐ اقدس نے اسے ختم کرنے کی کم سے کم مدت تین دن مقرر فرمائی تھی اور آپؐ خود اس کی ایک منزل روزانہ تلاوت فرمایا کرتے تھے اور سارا قرآن شریف سات دنوں میں ختم کیا کرتے تھے چنانچہ جب قبیلہ ثقیف کے وفد کے ایک رکن حضرت اوسؓ نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے جواب دیا تھا کہ مجھے قرآن کی منزل مکمل کرنی ہے جب تک یہ مکمل نہ کر لوں باہر نہیں آ سکتا۔

---

(۱۷) السیرۃ النبویہ لابن ھشام۔ الجزء الرابع ص ۱۹۴۔ مطبوعہ "دارالفکر" بیروت۔ بحواشی شیخ محمد محی الدین عبدالحمید۔

قرآن کی ایک منزل ایک دن میں مکمل کی جاتی تھی اور اس کی سات منزلیں ہیں پس اس سے ثابت ہوا کہ حضورؐ اقدس عام طور پر سات دن میں قرآن ختم فرمایا کرتے تھے۔ اگر قرآن کی ترتیب قائم نہیں ہو گئی تھی، اگر اس کی ہر منزل کی سورتوں کا تعین نہیں کر دیا گیا تھا تو ایک "منزل" مکمل کرنے کے الفاظ بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ مزید ثبوت ہے اس امر کا کہ قرآن کی ترتیب خود حضورؐ نے دے دی تھی اور اسی ترتیب کے مطابق ابوبکرؓ صدیق کے عہد میں اسے جمع کیا گیا تھا اور حضرت عثمانؓ نے اس نسخے کی نقول کروا کر وسیع پیمانے پر اس کی اشاعت کا اہتمام فرمایا تھا۔

قرآن حضورؐ کے عہد میں جمع کیوں نہ ہوا؟

یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ حضورؐ اقدس کا اصل مشن تو اللہ کا کلام لوگوں تک محفوظ حالت میں پہنچانا تھا اور اس کی سب سے بہتر صورت یہی تھی کہ آپؐ خود اسے اپنی حیات مبارکہ میں ایک جلد میں جمع فرما دیتے اور آپؐ کی زندگی ہی میں یہ جلد لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچ جاتی مگر آپؐ نے ایسا نہ کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ جب قرآن کا نزول شروع ہوا تو یہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے نازل ہوتا رہا۔ کبھی وقفہ مختصر ہوتا، کبھی طویل اور یہ سلسلہ حضورؐ کے وصال سے کچھ مدت پہلے تک جاری رہا۔ آخری سورت یا آیت کے نزول کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اعلان نہیں کیا گیا کہ "یہ آخری سورت یا آخری آیت ہے جو اے میرے رسولؐ! آپ پر نازل کی گئی ہے اب اور کچھ نازل نہیں ہو گا" ۔۔۔ اگر یہ اعلان کر دیا جاتا پھر تو حضورؐ صحابہؓ کو حکم دیتے کہ اب اسے میری مقررہ ترتیب کے مطابق ایک جلد میں جمع کرو کیونکہ جو کچھ نازل ہونا تھا نازل ہو چکا ۔۔۔ مگر چونکہ ایسا کوئی اعلان اللہ تعالیٰ کی طرف سے

نہیں کیا گیا اس لئے ہر وقت امکان تھا کہ شاید کوئی اور سورت نازل ہو جائے؟ شاید کوئی اور آیت یا کچھ اور آیات نازل ہو جائیں؟ معلوم نہیں ان کا مقام کون سی سورت میں ہو؟ ان آیات کو کہاں اور کن آیات کے ساتھ درج کرنا پڑے؟ اس لئے حضورؐ اقدس قرآن کو ایک جلد میں جمع نہ کر سکے مگر اس کی ترتیب مقرر فرما دی۔ اس ترتیب کے مطابق مزاج دانِ رسولؐ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے دوسرے مزاج دانِ رسولؐ زیدؓ بن ثابت کے ذریعے اسے ایک جلد میں جمع کروا دیا اور یہ کسی اختلاف کے بغیر آج تک ایک جلد میں یکجا ہے اور روئے زمین کے چپے چپے پر پڑھا جاتا ہے۔

جمعِ قرآن الٰہی فعل ہے

یہاں تک ہم نے قرآن کے جمع کرنے اور اس کی ترتیب کے بارے میں خارجی شہادتوں سے کام لیا ہے اب آخر میں ایک داخلی شہادت جس نے سارے اعتراضات کا قلع قمع کر دیا یعنی خود قرآن کی شہادت بلکہ قرآن نازل کرنے والے کی شہادت۔ آیئے دیکھیں اس کا کیا ارشاد ہے؟ اس کا قول تو اٹل اور قولِ فیصل ہے اور کارلائل تسلیم کرتا ہے کہ قرآن صدق ہی صدق ہے، اس میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ آج تک اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔

قرآن اپنے جمع و ترتیب کے بارے میں فرماتا ہے۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ○ (القیامہ۔ ۱۹)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس (قرآن) کا جمع کرنا اور اس کا (آپؐ کی زبان سے) پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم (یعنی ہمارا فرشتہ) پڑھا کرے تو (اے محمدؐ) آپ بھی اس کی پیروی کیا کیجئے۔ اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔)

گویا قرآن کا اعلان ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے قلبِ محمدؐ پر نازل کیا۔ اس کا نازل کرنے والا خود اعلان کرتا ہے کہ اسے جمع بھی ہم ہی کریں گے۔ اس کا طریق وہ یہ بتاتا ہے کہ (اے محمدؐ) کلام لے کر آپ کے قلب پر اترنے والا فرشتہ جب اسے آپ کو سنا دیا کرے تو آپ بھی اسے اسی طرح پڑھ لیا کیجئے تاکہ اچھی طرح یاد ہو جائے اور املا کراتے ہوئے کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ فرمایا کہ ہم نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ ہم اسے آپ کے ذریعے دنیا تک پہنچائیں گے اور اس طرح پہنچائیں گے کہ بیان کرنے کا حق ادا ہو جائے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ بڑی تحدی سے اعلان فرماتا ہے کہ قرآن کو جمع کرنا ہمارا کام ہے۔ اے میرے بندو! یاد رکھو محمدؐ رسول اللہ اسے بے ترتیب حالت میں چھوڑ کر دنیا سے ہرگز رخصت نہیں ہوں گے بلکہ ان کی وفات سے پہلے ہم اسے ان کے قلب و دماغ میں جمع کر دیں گے اور اس کی ترتیب بھی بتا دیں گے۔

پس ثابت ہوا کہ حضورؐ اقدس نے قرآن اپنی ذاتی رائے سے جمع نہیں کیا اس کی جمع و ترتیب تصرفِ الٰہی کے تحت ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا جمع کرنا ہمارا کام ہے، اگرچہ بظاہر محمدؐ رسول اللہ اسے جمع کر رہے ہیں اور اس کی ترتیب قائم کر رہے ہیں کہ کون سی سورت پہلے اور کون سی بعد میں ہونی چاہئے اور کون سی آیت کا مقام کہاں ہے (فرماتا ہے) مگر وہ یہ ترتیب ہماری ہدایت کے مطابق دے رہے ہیں کیونکہ اس کا جمع کرنا اور ترتیب دینا ہماری ذمہ داری ہے۔

پس جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کی موجودہ ترتیب درست نہیں اور اس کی ترتیب وہ ہونی چاہئے تھی جس کے مطابق یہ نازل ہوا تھا، ان کا اعتراض درست نہیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کیونکہ اس نے قرآن کو جمع کرنے کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ بظاہر یہ رسول اللہؐ کا فعل تھا مگر دراصل یہ فعلِ ربی تھا جس پر اعتراض کرنا خلافِ عقل بھی ٹھہرتا ہے۔

قرآن خُدا کا کلام ہے

کارلائل کہتا ہے کہ قرآن آنحضرت کی تصنیف ہے۔ یعنی یہ حضورؐ اقدس کے ذاتی افکار و خیالات پر مشتمل ہے، خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا۔ اس کی تشریح و توضیح وہ اس طرح کرتا ہے:

> "دراصل یہ ایک ایسی عظیم روح کا ابال ہے جو کسی مدرسے کی تربیت یافتہ نہ تھی۔ یہ ایک ایسے امی شخص کے افکار ہیں جو نہ لکھنا جانتا تھا اور نہ جسے پڑھنا آتا تھا مگر جو صدق دلی کے ساتھ نہایت پرجوش انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ خیالات کے ہجوم میں جو اس کے دل و دماغ میں امنڈ امنڈ کر آ رہے ہیں وہ کوشش کر رہا ہے کہ ان سارے خیالات کو دنیا تک پہنچا دے۔
>
> ---۔ حضرت محمدؐ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ آپؐ نے ۲۳ سال کی مدتِ نبوت جنگ و پیکار میں گزاری۔ آپؐ کی روح مستقل طور پر بے چین رہتی تھی اور جب راتوں کو ان مسائل پر غور فرماتے جو آپؐ کے پیش نظر تھے اور ان میں سے کسی کا حل نکل آتا تو آپؐ محسوس کرتے کہ یہ غیب کی طرف سے

آپؐ کے دل میں ڈالا گیا ہے اور جب آپؐ کسی معاملے کے بارے میں کوئی پختہ فیصلہ کر لیتے تو یہ سمجھتے کہ جبریلؑ کی طرف سے وحی کا نزول ہوا ہے۔“

گویا کارلائل کے خیال میں حضورؐ پر وحی نہیں اترتی تھی اور نہ جبریلؑ آتے تھے بلکہ جوش افکار میں آپؐ اپنے ہی خیالات کو وحی سمجھ لیتے تھے۔

ہمارے خیال میں، نہ صرف ہمارے خیال میں بلکہ حقیقت میں یہ بہت نادانی کا نظریہ ہے، یہ بہت ہی خلاف عقل بات ہے کہ ایک ہستی جو ذہانت و فراست اور حقیقت آفرینی میں خود کارلائل کے بقول بے نظیر شخصیت تھی وہ ایک دو مال نہیں بلکہ مسلسل ۲۳ سال تک ایک حقیقت کو واہمہ سمجھتی رہی۔ یہ تو ایسی دور از فہم بات ہے کہ اس سے زیادہ دور از فہم بات ہو سکتی ہی نہیں۔ اس کی تو خود قرآن تردید کرتا ہے جس کے بارے میں کارلائل خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ”اصلیت و صداقت کا مرقع ہے“ اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی حضورؐ اقدس) کا دامن ہر قسم کے مکرو فریب سے پاک تھا۔ آیئے دیکھیں کہ خود قرآن اپنے بارے میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کا اپنے بارے میں بیان

”اور یہ (قرآن) رب العالمین نے نازل کیا ہے“ (الشعراء۔ ۱۹۲)

”امانت دار فرشتہ اسے لے کر اترا ہے“ (الشعرا۔ ۱۹۳)

”اور (اے محمدؐ) آپؐ کو قرآن اس ہستی کی طرف سے دیا جا رہا ہے جو بہت ہی صاحب حکمت اور صاحب علم ہے“ (النمل۔ ٦)

”مجھے تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ میں کھول کھول کر بیان کر دینے والا نذیر ہوں“ (صٓ۔ ۷۰)

”ہم نے یہ کتاب آپ کی طرف کامل سچائیوں پر مشتمل نازل کی ہے“ (الزمر۔ ۲)

”ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب یقیناً لوگوں کے فائدے کی خاطر حق و حکمت کے ساتھ نازل کی ہے“ (الزمر۔ ۴۱)

”(اے رسول ان سے کہہ دیجئے) کہ اے میرے بندو! جنہوں نے گناہ کر کے اپنی جان پر ظلم کر لیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ سارے گناہ بخش سکتا ہے“ (الزمر۔ ۵۳)

”یہ قصہ ان غیب کی خبروں میں سے ہے جس کو وحی کے ذریعے سے ہم آپ تک پہنچاتے ہیں۔ اس سے قبل اس واقعے کو نہ آپ جانتے تھے، نہ آپ کی قوم جانتی تھی“ (هود۔ ۴۹)

”(آپ پر) نازل کیا گیا ہے“ (یٰسٓ۔ ۵)

”اور آپ کی طرف (بھی) اور آپؐ سے پہلے جو پیغمبر گزر چکے ہیں ان کی طرف وحی بھیجی گئی“ (الزمر۔ ٦۵)

”یہ کتاب غالب اور عالم خدا کی طرف سے نازل کی گئی ہے“ (المومن۔ ۲)

”اور ہم آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیج چکے ہیں (جن میں سے) بعض کا ذکر ہم نے آپ کے سامنے کر دیا اور بعض کا نہیں کیا اور کسی نبی و رسول کی طاقت میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم و اجازت کے بغیر کوئی کلام (اپنے آپ) لے آئے۔“ (المومن۔ ۷۸)

”یہ قرآن بے حد و حساب رحم اور بار بار مہربانی کرنے والے اللہ (تعالیٰ) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے“ (حٰم السجدہ۔ ۲)

”آپ کہہ دیجئے کہ میں بھی تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (مگر) مجھ پر یہ

وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا صرف ایک معبود ہے پس اس کا خیال کر کے استقلال دکھاؤ اور اس سے معافی مانگتے رہو" (حم السجدہ۔ ٦)

"اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بھی وحی یعنی اپنا حکم بھیجا۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور ایمان (کا کمال) کس چیز کا نام ہے" (الشوریٰ۔ ۵۲)

"قسم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں اتارا" (الدخان۔ ۲ و ۳)

"آپ ان سے فرما دیجئے کہ جو شخص جبریل کا اس وجہ سے دشمن ہو کہ اس نے اس (کتاب) کو اللہ (تعالیٰ) کے حکم سے آپ کے دل پر نازل کیا ہے تو۔۔۔" (البقرہ۔ ۹۷)

قرآن حکیم کے یہ چند مقامات ہیں ان پر غور فرمائیے۔ ان میں سے ہر آیت میں ایک ہی بات مختلف پیرایوں میں کہی جا رہی ہے اور بار بار اس لئے کہی جا رہی ہے تاکہ سننے والوں اور پڑھنے والوں کے ذہن نشین ہو جائے اور اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے۔۔۔۔ یہ کتاب محمدؐ رسول اللہ نے اپنے پاس سے نہیں بنائی یہ آپؐ کی تصنیف نہیں اسے حضورؐ اقدس کے ذاتی افکار و خیالات کا مجموعہ مت کہو، اگر ایسا ہوتا تو درمیان میں جبریلؑ نہ ہوتے" قرآن کہتا ہے کہ اس کتاب کا ہر جزو، ہر آیت جبریلؑ لے کر قلب محمدؐ پر نازل ہوئے۔

قرآن کہتا ہے کہ "اے میرے بندو! اللہ سے مایوس نہ ہو۔" اگر حضورؐ اقدس فرماتے تو "اے میرے بندو!" کے الفاظ کبھی استعمال نہ کرتے کیونکہ بندے تو خدا کے تھے اور خدا کے ہیں، محمدؐ رسول اللہ کے نہیں، اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ اقدس سے کہا جا رہا ہے کہ "اے محمدؐ! میرے بندوں سے

کہہ دیجئے کہ۔۔۔۔" گویا کہنے والا کوئی اور ہے، حضورؐ اقدس نہیں اور وہ خدا کے سوائے اور کون ہو سکتا ہے۔ ذیل کی اس آیت نے تو ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں چنانچہ فرمایا کہ:

> "کسی نبی و رسول کی طاقت نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی کلام خود لے آئے" (المومن۔ ۷۸)

پھر فرماتا ہے کہ جس رسول پر ہم نے کلام نازل کیا اس کا تو یہ حال ہے کہ:

> "(وہ تو) جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب اللہ کیا چیز ہے اور ایمان کی معراج کس چیز کا نام ہے" (الشوریٰ۔ ۵۲)

جبریل کا واسطہ

ایک اور بات بڑی غور طلب ہے۔ قرآن بار بار جبریلؑ کا ذکر کرتا ہے آخر یہ جبریلؑ کون ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ کسی خارجی وجود کا نام ہے جو قرآن کریم کے بقول محمدؐ رسول اللہ کے قلب مبارک پر نازل ہوتا تھا اور آپؐ کو احکام الٰہی پہنچاتا تھا۔ اسی لئے حضورؐ کے مخالف جبریلؑ سے دشمنی رکھتے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے رسولؐ:

> "(ان سے) فرما دیجئے کہ جو شخص جبریلؑ کا اس لئے دشمن ہے کہ اس نے اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کے دل پر نازل کیا تو اللہ تعالیٰ (بھی) ایسے لوگوں کا دشمن ہے" (البقرہ۔ ۹۷)

اگر جبریلؑ کا کوئی الگ وجود نہ ہوتا اور وہ کلام الٰہی لے کر حضورؐ اقدس کے قلب مبارک پر نہ اترتے جس کا کفار مکہ کو بھی علم ہو چکا تھا تو وہ آپؐ کے ساتھ ساتھ جبریلؑ کے بھی کیوں دشمن ہو جاتے۔

یہ اعتراض نیا نہیں کہ قرآن انسانی کلام ہے بلکہ خود حضورؐ اقدس کے زمانہ

میں ایسے لوگ موجود تھے جو قرآن کو محمدؐ رسول اللہ کا کلام سمجھتے تھے چنانچہ خود قرآن اس کی نشاندہی کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ:

> ”اور کہا کہ یہ تو جھوٹ ہے جو پہلوں سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ ایک انسانی کلام ہے“ (المدثر۔ ۲۵و۲۶)

پھر فرمایا:

> ”کیا وہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی حضورؐ اقدس) نے اسے اپنے پاس سے بنالیا ہے ایسا ہرگز نہیں۔ یہ کتاب تو آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے“ (السجدہ۔ ۳)

ان واضح ترین ارشادات الٰہی کے بعد بھی اگر کوئی اصرار کرے کہ نہیں قرآن محمدؐ رسول اللہ کا کلام ہے تو اس پر افسوس کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ خصوصاً“ وہ لوگ جو حضورؐ اقدس کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ آپؐ نہایت درجہ راست باز تھے اور ہر قسم کے فریب سے آپؐ کا دامن منزہ تھا ان کے لئے تو قرآن کو کلام الٰہی تسلیم کرنے کے سوائے کوئی چارہء کار ہی نہیں۔ ان میں کارلائل سرفہرست ہے جو تسلیم کرتا ہے کہ (حضرت) محمدؐ نہایت راستباز انسان تھے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

> ”حقیقت یہ ہے کہ ہم (حضرت) محمدؐ کو کسی طور بھی حرص و ہوس کا بندہ نہیں کہہ سکتے اور نہ منصوبہ باز قرار دے سکتے ہیں، نہ ہی آپؐ کی تعلیمات و فرمودات کو جہل و نادانی کے مجموعے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک امی کی حیثیت سے آپؐ جو پیغام لے کر آئے تھے وہ صدق ہی صدق تھا، وہ ایک ایسی آواز تھی جو پردہ غیب سے پرفشاں ہوئی ---- نہ تو اس ہستیؐ کے اقوال جھوٹے تھے، نہ اس کے افعال میں کھوٹ تھی۔ یہ وہ جلوہ تاباں تھا جسے خالق کائنات نے اپنی کائنات میں نور بکھیرنے کے لئے خود منتخب کیا تھا“ (۱)

غور کیجئے کہ ایسا شخص جو سراپا صدق ہو، جو پردہ غیب سے ظاہر ہوا ہو اور جسے خالق کائنات نے اپنی کائنات میں نور بکھیرنے کے لئے خود منتخب کیا ہو کیا وہ غلط بیانی کر سکتا ہے، وہ افترا سے کام لے سکتا ہے، کیا خدا کا انتخاب بھی غلط ہو سکتا ہے؟ کہ اس نے ایک ایسے شخص کو پیغام رسانی کے لئے چن لیا جو نعوذ باللہ اس سے بے وفائی کر گیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ جب خدا خود اعلان کرتا ہے کہ وہ میرا رسول ہے اور میں جبریلؑ کے ذریعے سے اس پر اپنا کلام نازل کرتا ہوں تو ان لوگوں کے لئے مجال انکار کب رہتی ہے جو محمدؐ رسول اللہ کو انتہائی راست باز بلکہ صدق کا پیکر قرار دیتے ہیں جن میں خود کارلائل بھی شامل ہے جو برملا اعتراف کرتا ہے کہ:

> ”محمدؐ وہ جلوہ تاباں تھے جنہیں خالق کائنات نے اپنی کائنات میں نور بکھیرنے کے لئے خود منتخب کیا تھا۔“

نور بکھیرنے کی غرض سے منتخب کیا ہوا پیغمبر کیا تاریکی بکھیر سکتا ہے؟ پھر جسے خود خدا نے منتخب کیا تھا، اس کے منہ سے تو سچ ہی نکلتا تھا، سچ اور صرف سچ۔ وہ سچ کیا تھا جو خدا ئی زبان سے نکل کر اس کی زبان میں جاری ہوا؟ وہ سچ یہ تھا:

---

(1) Heroes and Hero Worship. P-281 (Introduction) by (W.H.Hudson) J.M.Dent And Sons Ltd. Bedford Street. London. (1964)

"یہ (قرآن) رب العالمین خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے
(اور) ایک امانت دار کلام برداز فرشتہ (جبریلؑ) اسے لے کر
(اے محمدؐ) تیرے دل پر اترا ہے" (الشعرا۔ ۱۹۳ و ۱۹۴)

قرآن میں امور غیب

جو لوگ قرآن کریم کو حضورؐ اقدس کے افکار و خیالات قرار دیتے ہیں انہوں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ آپؐ خدا کے پیغمبر تو تھے مگر عالم الغیب تو نہیں تھے۔ نہ آپؐ علم نجوم جانتے تھے۔ اگر قرآن حضورؐ اقدس کے غور و فکر کا نتیجہ ہے تو اس میں مستقبل سے تعلق رکھنے والے امور کیسے بیان ہوئے۔ یعنی آپؐ کو کیسے معلوم ہوا کہ آپؐ کی وفات کے سو دو سو یا ہزار ڈیڑھ ہزار سال کے بعد کیا واقعات رونما ہوں گے اور پھر وہ من و عن اسی طرح رونما ہوئے جس طرح قرآن نے فرمایا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دو سمندروں کے باہم مل جانے کی خبر

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ
(الرحمان۔ ۱۹ و ۲۰)

یعنی اس نے دو سمندروں کو اس طرح جاری کیا ہے کہ ایک وقت میں دونوں باہم مل جائیں گے (مگر) فی الحال درمیان میں ایک روک ہونے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی طرف نہیں بڑھ سکتے۔

یہ اشارہ ہے نہر سوئز اور نہر پاناما کی طرف جن کی تعمیر کے بعد دو سمندر باہم مل گئے۔ ایک نہر وہ جس نے بحر قلزم اور بحر روم کو آپس میں ملا دیا یعنی نہر سوئز جب تک یہ نہر نہیں کھودی گئی تھی اس وقت زمین کے اس ٹکڑے نے دونوں سمندروں کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا مگر اس نہر کے مکمل ہوتے ہی بحر قلزم اور بحر روم باہم مل گئے۔ دوسری نہر وہ ہے جسے نہر پاناما کہتے ہیں۔ جب تک یہ نہر تعمیر نہیں ہوئی تھی اس وقت تک بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل ایک دوسرے سے الگ تھے مگر اس نہر کی تعمیر کے بعد یہ دونوں سمندر آپس میں مل گئے۔

پھر قرآن نے نشاندہی بھی کر دی کہ وہ کون سے سمندر ہیں جو مستقبل بعید میں باہم ملا دیئے جائیں گے، فرمایا ان کی پہچان یہ ہے کہ:

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (الرحمٰن۔ ۲۲)

(یعنی ان دونوں میں سے موتی اور مونگا بر آمد ہوتا ہے)

کون نہیں جانتا کہ موتی اور مونگے انہی دونوں سمندروں میں سے بہت کثرت سے بر آمد ہوتے ہیں۔ غور کیجئے اور بار بار غور کیجئے کہ آخر وہ کون سی ہستی ہے جس نے محمدؐ رسول اللہ پر چودہ سو سال قبل یہ حقیقت منکشف فرمائی کہ ایک زمانہ آئے گا جب ان سمندروں کو باہم ملا دیا جائے گا جو درمیان میں خشکی ہونے کی وجہ سے آج ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ محمدؐ رسول اللہ عالم الغیب تو نہیں تھے۔ آپؐ کے بارے میں تو قرآن حکیم نے آپؐ ہی کی زبان سے اعلان فرمادیا کہ:

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (الانعام۔ ۵۰)

یعنی میں علم غیب نہیں جانتا۔ پھر فرمایا:

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ
وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (الاعراف۔ ۱۸۸)

(یعنی اگر میرے پاس علم غیب ہوتا تو میں بہت سی بھلائیاں (اپنے لئے) جمع کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی)

پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضورؐ اقدس تو غیب نہیں جانتے تھے سوائے اس

علم غیب کے جو اللہ تعالیٰ آپؐ کو بتا دیتا تھا۔ گویا آپؐ کے علاوہ کوئی اور ہستی تھی جو عالم الغیب بھی تھی اور اسی ہستی نے حضورؐ اقدس کو بتایا کہ اے میرے رسول! آج دنیا جن دو سمندروں کو ایک دوسرے سے الگ دیکھ رہی ہے آپ دنیا کو بتا دیجئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب یہ دونوں باہم مل جائیں گے۔ فرمایا کہ ان کی علامت یہ ہے کہ ان میں سے موتی اور مونگے بکثرت برآمد ہوتے ہیں۔ اور یہی ہوا بھی۔ پس ثابت ہوا کہ محمدؐ رسول اللہ کے قلب پر قرآن نازل کرنے والا کوئی اور تھا جو عالم الغیب ہے۔

مملکت اسرائیل کے قیام کی خبر

قرآن میں ایک قوم کا ذکر آتا ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ یہ قوم اپنے نبیوں کو قتل کیا کرتی تھی۔

يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ (آل عمران۔ ۱۱۲)

یعنی قوم یہود۔ قرآن اس قوم کے مستقبل کے بارے میں حیران کن خبر دیتا ہے، فرماتا ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران۔ ۱۱۲)

(یعنی ان پر ذلت مسلط کر دی گئی خواہ یہ کہیں بھی ہوں سوائے اس کے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کسی عہد کے نیچے آ جائیں یا اس کے (کچھ) بندوں کے عہد کے نیچے (اس صورت میں یہ ذلت و غلامی سے نجات پا جائیں گے)

یعنی یہ قوم ہمیشہ اور ہر جگہ ذلیل رہے گی، ہاں دو صورتیں ہیں ان میں سے جو صورت بھی یہ لوگ اختیار کر لیں گے انہیں عزت و اقتدار نصیب ہو جائے گا۔ وہ دو صورتیں یہ ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے عہد استوار کر لیں، یعنی اپنی

نافرمانی سے توبہ کر لیں، اللہ کی طرف رجوع کر لیں اور اسلام قبول کر لیں۔ اگر یہ صورت اختیار نہیں کرتے تو فرمایا دوسری صورت یہ ہے کہ یہ اللہ کے کچھ بندوں سے عہد استوار کر لیں ان کی پناہ اور سرپرستی میں آ جائیں تو اس صورت میں بھی ان کی ذلت و خواری اور دربدری ختم ہو جائے گی اور انہیں عزت و اقتدار مل جائے گا۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ یہودی اس وقت بھی ذلیل و خوار کئے گئے جب عرب پر اسلام کا سورج طلوع ہوا، انہیں ان کی بدعہدی اور ظلم کی وجہ سے مدینہ اور اس کے قرب و جوار سے قتل کر کے اور باقی کو بے سرو سامان کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور اس کے بعد صدیوں تک ان پر ذلت و خواری مسلط رہی مگر جنگ عظیم کے موقع پر جب انہوں نے اتحادی طاقتوں سے عہد استوار کر لیا اور ان کی پناہ اور سرپرستی میں آ گئے تو اسرائیل کے نام سے ان کی سلطنت قائم ہو گئی جو آج بھی قائم ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک قائم رہے گی۔

سوچئے کہ جس وقت (حضورؐ اقدس کے قیام مدینہ) کے دوران یہ آیات نازل ہوئیں تو کون کہہ سکتا تھا کہ ہر طرف سے ذلیل و خوار کئے جانے والے یہودی ایک دن اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ خود عرب ان کے ہاتھوں شکست کھا کر خستہ و خوار ہو جائیں گے اور دنیا کے نقشے پر ان یہودیوں کی طاقت ایک مستحکم ریاست کی صورت میں ابھرے گی جس سے عرب مملکتیں خم کھایا کریں گی۔ قرآن کی یہ پیش خبری کس شان سے پوری ہوئی۔ سوچئے آخر حضورؐ اقدس کو چودہ سو سال بعد رونما ہونے والے واقعے کی خبر صدیوں پہلے کیسے ہو گئی۔ ثابت ہوا کہ حضورؐ اقدس پر قرآن نازل کرنے والا خدا عالم الغیب تھا اسی نے آپؐ کو مستقبل میں پیش آنے والے اس واقعے کی خبر دی تھی جو من و عن اور بڑی شان سے درست ثابت

ہوئی۔

سفر کی سہولتوں کی خبر

قرآن آج سے چودہ سو سال قبل حضورؐ اقدس کے ذریعے ساری دنیا کو خبر دیتا ہے کہ:

وَاٰیَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ
○ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا یَرْكَبُوْنَ (یٰسٓ۔ و ۴۲)

(یعنی ہماری نشانیوں میں سے) ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہم ان کی نسل کو کشتیوں میں سوار کرتے ہیں جو (مسافروں سے) بھری ہوتی ہیں اور ہم ان کے لئے اسی جیسی اور بھی چیزیں پیدا کریں گے جنہیں یہ لوگ سواری کے طور پر استعمال کریں گے)

کتنی واضح خبر ہے مستقبل کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے لوگو! ہم تمہارے سامنے اپنا ایک عظیم الشان نشان بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آج تم تو کشتیوں کے ذریعے یا بادبانی جہازوں کے ذریعے سفر کرتے ہو (گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں کے ذریعے خشکی کا سفر طے کرتے ہو) لیکن ایک زمانہ آئے گا جب ہمارا ایک عظیم الشان نشان ظاہر ہوگا، ایک حیران کن نشان۔۔۔۔؟ جس کے نتیجے میں تمہارے سفر کا سارا منظر ہی بدل جائے گا۔ وہ نشان یہ ہوگا کہ تمہارے موجودہ وسائل سفر کے علاوہ کچھ اور آلاتِ سفر پیدا کئے جائیں گے، کچھ اور وسائلِ سفر مہیا کئے جائیں گے جنہیں تم کام میں لاؤ گے اور تمہارے لئے سفر آسان ہو جائے گا۔ کیا اس قرآنی ارشاد میں واضح طور پر ان زمانہ ء جدید کے ان دیو پیکر جہازوں اور سمندری سفر کی ایجادات کی خبر موجود نہیں جس کا آج سے چودہ سو سال قبل کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

ایک اور مقام پر قرآن شریف مستقبل میں ظاہر ہونے والی ایجادات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے جو بہت ہی حیران کن ہیں۔ فرماتا ہے:

وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِیْنَةً وَ
یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل۔۸)

(یعنی اس (اللہ) نے (تمہارے لئے) گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ ان پر سوار ہو کر (سفر طے کر سکو) اور اس میں تمہاری زینت اور شان کا بھی سامان ہے اور وہ تمہارے لئے اسی قسم کی (سفری) چیزیں اور بھی پیدا کرے گا جن سے تم (فی الحال) ناواقف ہو۔ (نہیں جانتے ہو۔)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس وقت تو تم سفر کے لئے گھوڑے، خچر، گدھے (اور اونٹ وغیرہ) استعمال کرتے ہو لیکن ایک زمانہ آئے گا جب ہم کچھ اور ایسے وسائلِ سفر تمہیں مہیا کریں گے جن سے اس وقت تم بے خبر اور لاعلم ہو۔ (مَا لَا تَعْلَمُوْنَ)

آخر وہ کون سے وسائل سفر تھے جن سے نزولِ قرآن کے وقت لوگ لاعلم اور ناواقف تھے؟ مگر جن کے بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ مستقبل بعید میں ایسے وسائلِ سفر پیدا ہو جائیں گے۔ کیا اس ارشاد قرآنی میں واضح طور پر موٹر، ریل، کار، ہوائی جہاز، بس، ویگن اور ان جیسی دوسری سفری ایجادات کی خبر نہیں دی گئی؟ آج سے چودہ سو سال قبل کیا ان ایجاداتِ عظیم اور حیران کر دینے والے ان وسائلِ سفر کا کوئی تصور بھی کر سکتا تھا؟ کیا کسی کے وہم و گمان میں بھی آ سکتا تھا کہ سینکڑوں میل کا جو سفر آج دنوں اور بعض دفعہ مہینوں میں بمشکل طے ہوتا ہے، ایک زمانہ آئے گا جب طویل ترین اور جان جوکھوں کا یہ سفر چند گھنٹوں میں بہت آرام سے طے ہو جایا کرے گا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو مستقبل بعید میں پیدا ہونے

والے ان وسائلِ سفر کا کیسے علم ہو گیا؟ چودہ سو سال قبل کس نے آپؐ کو بتادیا۔ پس ثابت ہوا کہ حضورؐ اقدس پر قرآن نازل کرنے والی کوئی اور ہستی ہے جو عالم الغیب ہے۔ یہ آپؐ کی تخلیق اور آپؐ کے افکار نہیں بلکہ خداوند کریم کے ارشادات ہیں جو من و عن درست ثابت ہوئے۔

بموں اور ایٹمی ہتھیاروں کی خبر

آج سے چودہ سو سال قبل کون تصور کر سکتا تھا کہ وہ آسمان جو ابر رحمت برساتا ہے ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب وہی آسمان بنی نوع انسان کی گمراہیوں اور بدکاریوں کے سبب اس پر آگ برسائے گا جس کے نتیجے میں آبادیوں کی آبادیاں فنا کے گھاٹ اتر جائیں گی چنانچہ ارشاد ہوا:

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ (الرحمٰن۔۳۵)

(یعنی اے لوگو!) تم پر دھواں اور آگ کا شعلہ گرایا جائے گا)

اس سے قبل دو بڑی طاقتوں کا ذکر کیا گیا:

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (الرحمٰن۔۳۱)

(یعنی اے دو بڑی طاقتو! اب ہم تمہاری طرف متوجہ ہو رہے ہیں)

گویا قرآن کہہ رہا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب دو طاقتیں دنیا کے سیاہ و سفید کی مالک بن جائیں گی۔ یہ عظیم سلطنتیں ایٹمی طاقت حاصل کرلیں گی، اپنے مخالفوں پر آگ کے شعلے برسائیں گی اور دھواں پھینکیں گی جس کے نتیجے میں زمین پر سخت تباہی آئے گی۔ فرماتا ہے کہ لیکن پھر ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ یہ دونوں طاقتیں بھی تباہ کردی جائیں گی۔ "سنفرغ" ----میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اے دنیا کی دو بڑی طاقتو! جو آج عروج پر ہو اور بظاہر ناقابل شکست نظر آتی ہو عنقریب ہم تمہاری طرف بھی متوجہ ہوں گے اور تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔

کیا قرآن شریف کی یہ عظیم خبر---- یہ پیش خبری پوری نہیں ہو گئی؟ آسمان سے بموں کی بارش اور فضائے آسمانی میں دھویں کا پھیل جانا---- بلکہ زمین سے آسمان تک دھواں ہی دھواں----! گذشتہ نصف صدی میں دنیا نے یہ منظر ایک سے زیادہ بار دیکھے اور خدا ہی جانتا ہے کہ ابھی کتنی بار اور دیکھے گی؟

کیا ان دو بڑی طاقتوں میں سے ایک ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو گئی؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اسے ابھی شکست و ریخت کے کتنے مراحل سے گزرنا ہے؟ دوسری طاقت بھی کسی وقت اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ یہ خدا کی باتیں ہیں جو پوری ہو کر رہیں گی۔

کوئی بتائے کہ آج سے چودہ سو سال قبل اس پیغمبرؐ امی کو جو علمِ نجوم بھی نہیں جانتا تھا غیب کی یہ خبریں کیسے معلوم ہو گئیں؟ معلوم ہوا کہ کوئی ہستی ہے جس نے اسے غیب پر مطلع کیا۔ اسی نے اس پر قرآن نازل کیا جس میں مستقبل کے واقعات بیان کئے گئے ہیں جو علم غیب رکھنے والا ہی بیان کر سکتا تھا اور وہ خدا کے سوائے اور کون ہو سکتا ہے۔

شاید کوئی اعتراض کرے کہ قرآن شریف میں یہ واقعات تو قیامت کے سلسلے میں بیان کئے گئے ہیں انہیں قبلِ قیامت کے زمانے پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے؟ بلاشبہ قرآن شریف میں یومِ حشر یا روزِ قیامت کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں اس روز انسانوں پر جو سزا نازل ہوگی اس کا بھی بیان ہے مگر قرآن میں قبلِ قیامت کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں بلکہ زیادہ واقعات کا تعلق قبلِ قیامت ہی سے ہے تاکہ انسان ان سے عبرت حاصل کرے اور قیامت آنے سے قبل اپنے اعمال کو درست کرے۔

جو لوگ ان واقعات کو روزِ قیامت تک محدود کرتے ہیں ان کی توجہ کے لئے

ہم مندرجہ ذیل آیات پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَارۡتَقِبۡ یَوۡمَ تَاۡتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیۡنٍ (الدخان۔۱۰)

"سو اس دن کا انتظار کرو جب آسمان پر کھلا کھلا دھواں ظاہر ہو گا"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اس وقت یہ کہیں گے کہ:

رَبَّنَا اکۡشِفۡ عَنَّا الۡعَذَابَ اِنَّا مُؤۡمِنُوۡنَ (الدخان۔۱۲)

"اے ہمارے رب! اس عذاب کو ہم سے دور کر دیجئے ہم ضرور ایمان لے آئیں گے"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

اِنَّا کَاشِفُوا الۡعَذَابِ قَلِیۡلًا اِنَّکُمۡ عَآئِدُوۡنَ (الدخان۔۱۵)

"یعنی اس پر ہم کچھ مدت کے لئے اس عذاب کو تم سے دور کر دیں گے مگر) تم پھر اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جاؤ گے' (یعنی پھر وہی حرکتیں کرنے لگو گے)"

ان آیات پر غور کیجئے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب آسمان پر ایسا دھواں ظاہر ہو گا جو بڑا سخت اور خوفناک ہو گا۔ گویا یہ ایٹمی اسلحہ کے استعمال ہونے کی خبر ہے۔ فرماتا ہے اس اذیت ناک کیفیت کو دیکھ کر لوگ التجا کریں گے کہ کاش یہ عذاب ہم سے ہٹا دیا جاتا۔ فرماتا ہے کہ ان کی گریہ و زاری دیکھ کر ہم ان کی التجا قبول کر لیں گے اور کچھ مدت کے لئے عذاب کو ان سے دور کر دیں گے مگر یہ لوگ پھر وہی حرکتیں کرنے لگیں گے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اگر یہ واقعات قیامت کے روز پیش آئیں گے جب دنیا کا اختتام ہو جائے گا تو کیا اس روز نیک یا بد اعمال کرنے کی مہلت دی جائے گی؟ اور لوگ پھر دنیا میں آ کر اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں گے۔ یہ تو عقلاً ہی غلط ہے کیونکہ جب قیامت برپا ہو جائے گی تو عذاب کو کچھ مدت کے لئے دور کر دینے کا موقع کہاں ہو گا اور اتنی مہلت کب اور کسے دی جائے گی کہ وہ پھر اپنی پہلی زندگی کی طرف واپس آئے اور اسے نیک یا بد عمل کرنے کی آزادی ہو۔ اس روز تو ساری بساط ہی لپیٹ دی جائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ ان واقعات کا تعلق اس دنیا سے ہے اور قبل قیامت سے ہے۔ گویا آج سے چودہ سو سال قبل اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو خبر دے دی تھی کہ ایک زمانہ آئے گا جب نہایت خوفناک اور تباہ کن ایٹمی اسلحہ ایجاد ہوں گے جن سے روئے زمین پر بہت بڑے پیمانے پر تباہی پھیلے گی۔ یہ تباہی دیکھ کر انسان لرز اٹھے گا اور اللہ تعالیٰ سے اس عذاب کو دور کر دینے کی التجا کرے گا۔ کیا قرآن حکیم کی یہ خبر درست ثابت نہیں ہوئی؟ غیب کی یہ خبر عالم الغیب کے سوائے اور کون دے سکتا تھا۔ اسی عالم الغیب خدا نے محمدؐ الرسول اللہ پر قرآن نازل کیا۔

کتب و رسائل کی اشاعت کے بارے میں خبر

اسی عالم الغیب خدا نے قرآن کے ذریعے حضورؐ اقدس کو مستقبل کی ایک اور خبر دی جو کسی کے وہم و گمان میں نہ آ سکتی تھی فرمایا:

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ (التکویر۔۱۰)

"اور جب صحائف پھیلا دیئے جائیں گے"

یعنی ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب اس قدر رسالے' اخبارات اور کتابیں شائع ہوں گی کہ دنیا کا کوئی شہر ان سے خالی نہ رہے گا۔ یہ دعویٰ ایک ایسے شہر میں کیا جا رہا ہے جہاں کوئی صحافت کا نام بھی نہ جانتا تھا یعنی مکہ مکرمہ۔ اُس زمانے میں کہا جا رہا ہے جب ساری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور عرب تو تاریکی کے انتہائی مقام پر پہنچ چکا تھا' وہی ہوا۔ آج دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے شہر سے بھی اخبارات اور رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ خواندہ افراد کا کوئی گھر کتابوں سے خالی نہیں اور قرآن شریف تو ایک ایسا صحیفہ مقدس ہے جو مسلمانوں کے ہر گھر میں موجود ہے۔ کیا

صحائف کے پھیلائے جانے کا ایسا عظیم الشان منظر آج سے چودہ سو سال قبل کسی بھی انسان کی چشم تصور میں آ سکتا تھا؟ آخر وہ کون تھا جس نے حضورؐ اقدس کو بتایا کہ اے میرے رسولؐ اعلان کر دیجئے کہ دنیا پر ایک زمانہ آنے والا ہے کہ جب ہر طرف کتابیں ہوں گی، رسالے ہوں گے، صحائف آسمانی (بائیبل اور قرآن) تو اس قدر کثرت سے شائع کئے جائیں گے کہ شمار میں نہ آ سکیں گے۔ جس ہستی نے محمدؐ رسول اللہ کو غیب کی یہ خبر دی وہی قرآن کا نازل کرنے والا عالم الغیب خدا ہے۔

فرعون کی جسمانی نجات کی خبر

قرآن شریف اور بائیبل دونوں میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان پیش آنے والے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ بلاشبہ بعض جگہ دونوں میں حیرت انگیز مشابہت بھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو تعلیم دینے والا اور ان پر وحی نازل کرنے والا ایک ہی ہے گویا دونوں نے ایک ہی چشمے سے پانی پیا تھا۔ اس کے باوجود قرآن نے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان پیش آنے والے بعض ایسے واقعات بھی بیان کئے ہیں جن کا سرے سے بائیبل میں ذکر ہی نہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ محمدؐ رسول اللہ نے یہ واقعات بائیبل سے معلوم کر کے بیان کر دیئے ہوں گے۔

جس واقعے کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ فرعون کا یہ اعلان ہے جو اس نے ڈوبتے وقت کیا تھا کہ ـــــ "میں بنی اسرائیل کے رب پر ایمان لاتا ہوں۔" فرعون کے اس اعلان کا قرآن نے تو ذکر کیا ہے مگر بائیبل اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے۔ ذیل میں بائیبل کی وہ آیات درج کی جاتی ہیں جو فرعون اور اس کے لشکر کے انجام سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے بعد اس واقعے سے متعلق قرآنی آیات پیش کی جائیں گی۔ بائیبل کہتی ہے:

"پھر موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا ○ اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا ○ اور مصریوں نے تعاقب کیا اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ اور سواران کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے ○ اور رات کے پچھلے پہر خداوند نے آگ اور بادل کے ستون میں سے مصریوں کے لشکر پر نظر کی اور ان کے لشکر کو گھبرا دیا ○ اور اس نے ان کے رتھوں کے پہیوں کو نکال ڈالا سو ان کا چلانا مشکل ہو گیا۔ تب مصری کہنے لگے آؤ ہم اسرائیلیوں کے سامنے سے بھاگیں کیونکہ خداوند ان کی طرف سے مصریوں کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ ○

اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تا کہ پانی مصریوں اور ان کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے ○ اور موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آ گیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہہ و بالا کر دیا ○ اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا ○ پر

> بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا○ سو خداوند نے اس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے اس طرح بچایا اور اسرائیلیوں نے مصریوں کو سمندر کے کنارے مرے ہوئے پڑے دیکھا○ اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اس کے بندہ موسیؑ پر ایمان لائے"○(۲)

اس پورے بیان میں یا اس کے بعد کسی جگہ بائیبل فرعون کی زندگی کے آخری لمحات کا قطعاً" ذکر نہیں کرتی اور قرآن کے نزول کے وقت تک ساری دنیا اس سے بے خبر تھی۔ قرآن پہلی کتاب ہے جو دنیا کو پہلی بار اطلاع دیتی ہے کہ فرعون نے اپنا اور اپنے لشکر کا انجام دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی جناب میں کیا عرض کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے کیا جواب دیا تھا؟ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

حَتّٰیٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیٓ
اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (الخ)
(یونس۔ ۹۰)

یعنی یہاں تک کہ جب (فرعون) ڈوبنے لگا تو (سراسیمہ ہوکر) کہنے لگا کہ میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کہ بجز اس کے اور کوئی

---

(۲) بائیبل۔ (کتاب خروج) باب ۱۴۔ آیت ۲۱ تا ۳۱۔

معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں۔ جواب دیا گیا کہ اب (جبکہ ڈوب رہا ہے) ایمان لاتا ہے (حالانکہ) پہلے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا سو (تجھے نجات دینے کی بجائے) آج ہم تیرے جسم کو (سمندر میں تہہ نشیں ہونے سے) نجات دیں گے (بچالیں گے) تاکہ تو اپنے بعد آنے والوں کے لئے موجب عبرت ہو جائے۔

ان آیات میں اعلان کیا جا رہا ہے کہ فرعون کا ایمان جناب الٰہی میں قبول نہیں ہوا، وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکا اور اپنے ساتھیوں سمیت غرق ہو گیا مگر اس کے جسم کو بچالیا گیا تاکہ وہ ایک نشان الٰہی کے طور پر دنیا میں موجود رہے اور اس کے بعد آنے والی انسانی نسلیں اس کی نعش کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں اور حضرت موسیؑ اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صداقت پر ایمان لائیں جن کی صداقت کی گواہی خود یہ جسم دے رہا ہے۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ فرعون موسیؑ کی نعش آج بھی موجود ہے اور مصر کے عجائب گھر میں پڑی ساری دنیا کو درس عبرت دے رہی ہے۔ اس نعش کے ساتھ جو تختی رکھی ہے اس پر اس کا نام بھی درج ہے "منفتاح" یہی منفتاح حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مصر کا حکمران تھا۔ اس کا عہد حکومت بھی اس تختی پر درج ہے جو گیارہ سال سے چند ماہ زیادہ کا تھا۔

یہ بہت غور کا مقام ہے کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ پر نازل ہونے والے قرآن میں آج سے چودہ سو سال قبل اعلان کیا جاتا ہے کہ فرعون اپنے ساتھیوں سمیت غرق ضرور ہو گیا تھا مگر اس کا جسم محفوظ رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ اقدس کو کیسے معلوم ہوا کہ فرعون کی نعش محفوظ ہے، اس وقت تو کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ فرعون کی نعش اس وقت کہاں ہے؟ موجود بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ سمندر میں

ڈوبنے والے شخص کے بارے میں یہ بھی تو امکان ہوتا ہے کہ اسے کسی بحری مخلوق نے کھالیا ہو' دوسری بات یہ کہ اس وقت تک تو فرعونوں کی ممیوں (حنوط شدہ نعشوں) کے بارے میں بھی کسی کو بلکہ خود اہل مصر کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں دفن ہیں اور ان میں سے کتنی نعشیں دفن ہیں اور کس کی نعش کس مقام پر دفن ہے؟ مگر قرآن پوری تحدی سے اعلان کرتا ہے کہ فرعون کا جسم محفوظ ہے تاکہ لوگ اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن محمدؐ رسول اللہ کی تصنیف نہیں بلکہ یہ خدائے عالم الغیب کا کلام ہے جو اس نے اپنے بندے اور رسولؐ پر نازل کر کے اسے اس واقعہ غیب پر مطلع کیا۔

دشمنان رسولؐ کی ذلت کی خبر

کون نہیں جانتا کہ حضورؐ اقدس کی مکی زندگی کس قدر پُر خطر تھی' قدم قدم پر آپؐ کے دشمن موجود تھے بلکہ سارا شہر آپ کا دشمن ہو چکا تھا' ہر شخص آپؐ کی جان کے درپے تھا۔ آپؐ کو راستے سے ہٹانے کے لئے کیسے کیسے خطرناک منصوبے بنائے جا رہے تھے اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان حالات میں آپؐ اپنی طبعی عمر کو پہنچ سکیں گے یا اس سے پہلے ہی آپؐ کو قتل کر دیا جائے گا۔ ان قطعی ناموافق حالات میں اعلان ہوتا ہے اور مکہ ہی میں اعلان ہوتا ہے کہ:

اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ (کوثر۔ ۳)

"(اے رسول) آپ کا دشمن ہی ذلیل و خوار ہو گا اور بے نام و نشاں رہ جائے گا۔"

اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ تمام تر مخالفتوں اور انتہائی نامساعد حالات کے باوجود نہ صرف زندہ رہیں گے بلکہ کامیاب و کامراں ہوں گے اور آپؐ کے دشمن ذلیل و خوار اور بے نام و نشاں ہو جائیں گے' ان کی نسلیں معدوم ہو

جائیں گی ---- اور پھر دنیا نے دیکھا کہ یہ پیش خبری کس شان سے پوری ہوئی۔ وہ سرداران قریش جنہیں اپنی شجاعت' اپنی کثرت اور اپنے اموال پر بے حد فخر و ناز تھا ان میں سے ایک ایک حضورؐ اقدس کی آنکھوں کے سامنے بری طرح ذلیل و خوار ہوا اور آج اس کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں۔ آج کوئی ہے جو اپنے آپ کو ابوجہل سے منسوب کرے؟ کوئی ہے جو اپنے آپ کو ابولہب سے منسوب کرے؟ کوئی ہے جو اپنے آپ کو عتبہ یا شیبہ سے منسوب کرے؟ ---- کوئی نہیں' یقیناً کوئی نہیں۔ مگر اپنے آپ کو محمدؐ رسول اللہ سے منسوب کرنے والے لاکھوں نہیں کروڑوں ہیں بلکہ ہر مسلمان خود کو حضورؐ اقدس سے منسوب کرنے میں سب سے بڑی سعادت محسوس کرتا ہے۔

دشمن کہتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) تو مقطوع النسل ہیں' ان کی تو اولادِ نرینہ ہی نہیں' مگر اللہ تعالیٰ اعلان کرتا ہے کہ نہیں ایسا ہرگز نہیں' محمدؐ رسول اللہ کو اتنے روحانی بیٹے دیئے جائیں گے کہ شمار میں نہیں آسکیں گے اور اے رسول کے مخالفو! تم مقطوع النسل ہو جاؤ گے۔ چنانچہ کون نہیں جانتا کہ تمام سردارانِ قریش کے بیٹے اپنے باپوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر محمدؐ رسول اللہ کے قدموں میں آبیٹھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے کافر باپ کے دین پر قائم نہ رہا سب نے حضورؐ اقدس سے رشتہ و پیوند جوڑنے کو ہی سعادتِ ابدی خیال کیا۔

وہ قریش مکہ جنہوں نے بڑی ہی بے سروسامانی اور کس مپرسی کی حالت میں حضورؐ اقدس کو وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر مدینہ میں بھی آپؐ کو چین نہ لینے دیا اور بار بار متحدہ لشکروں کے ساتھ حملے کئے تاکہ اس پاکؐ وجود کو اس شہر سے بھی نکال دیں ---- مگر چند ہی سال گزرے تھے کہ وہی قریش مکہ مفتوح و مغلوب کی حیثیت سے حضورؐ اقدس کے سامنے کھڑے پناہ کی بھیک مانگ

رہے تھے۔ کس شان سے یہ پیش خبری پوری ہوئی کہ ---- اے میرے رسول اگرچہ اس وقت تو سخت تکلیف میں ہے، دشمن کے حملوں کی زد میں ہے، بظاہر کوئی تیرا پرسان حال نہیں لیکن ہم تجھے بشارت دیتے ہیں کہ وہ دن آیا ہی چاہتا ہے کہ:

"تیرا دشمن ذلیل و خوار ہو جائے گا"
اور تو عزت و اقتدار پائے گا۔"

سوچئے ---- اور سو بار سوچئے! کہ محمدؐ رسول اللہ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اس اعلان پر ---- اس دعوے پر ---- اس بشارت پر ---- چند سال بھی نہیں گزریں گے کہ یہ اعلان ---- یہ وعدہ ---- یہ بشارت بڑی شان سے پوری ہو جائے گی جبکہ کوئی شخص اپنی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ کوئی ہستی تھی جو محمدؐ رسول اللہ سے کلام کر رہی تھی آپؐ کو غیب پر مطلع کر رہی تھی، پس قرآن اسی ہستی کا کلام ہے۔

یہ سات مثالیں ہیں جو بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں ورنہ سارا قرآن غیب کی خبروں سے بھرا ہوا ہے جو اس امر کا غماز ہے کہ یہ کتاب مقدس محمدؐ رسول اللہ کی تصنیف نہیں بلکہ خدائے عالم الغیب کی طرف سے غیب کی خبریں لے کر آپؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوئی۔

قرآن اور قریش مکہ

اب ہم اس موضوع کو زیر بحث لاتے ہیں جو سب سے زیادہ نازک اور حساس موضوع ہے اور جس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کارلائل نے سخت ٹھوکر کھائی یعنی قرآن حکیم۔ اس کتاب مقدس پر گفتگو کرتے ہوئے کارلائل نے نہ صرف احتیاط کا دامن چھوڑ دیا بلکہ غور و فکر اور تحقیق کا بھی پورا حق ادا نہیں کیا۔ قرآن حکیم کے بارے میں پہلے کارلائل کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے پھر ان کا تجزیہ کیا جائے گا۔ کارلائل کہتا ہے:

> "قرآن پڑھتے وقت مجھے اس کے مطالعے میں کوئی لطف نہیں آیا۔ مجھے تو یہ بہت ہی پیچیدہ اور بے ربط معلوم ہوا۔ ایک ہی بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ اس تکرار نے قرآن کے معنی کو بالکل خبط کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے آسمانی کتاب سمجھ کر کیونکہ پڑھا جا سکتا ہے یا اسے فصیح و بلیغ کتاب کیسے کہا جا سکتا ہے بلکہ اسے تو سرے سے کتاب ہی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو منتشر نغمات کا ایک غیر مربوط مجموعہ ہے جس کا اسلوب بھی ناقص ہے۔ اس کے باوجود یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ اس پر کوئی قطعی حکم لگانے میں ہمارے لئے بہت سی رکاوٹیں ہیں جن میں سے ایک بڑی رکاوٹ عربی زبان سے ہماری

> ناواقفیت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی خوبیاں عربی زبان جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ترجمہ کرنے سے یہ خوبیاں زائل ہو جاتی ہیں۔"

کیا یہ انتہائی تعجب انگیز بات نہیں کہ کارلائل نے خود ہی اپنے دعوے کی تردید کر دی اور ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں کہہ دیں۔ ایک طرف تو وہ اعتراض کرتا ہے کہ قرآن بے ربط کلام ہے اور کثرتِ تکرار کی وجہ سے اس کے معنی خبط ہو گئے ہیں، قرآن میں فصاحت و بلاغت نہیں اور اس کی بے ربطی کی وجہ سے اسے کتاب ہی نہیں کہا جا سکتا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ "اس کا اصل حسن عربی زبان میں ہے اور چونکہ ہم عربی سے نابلد ہیں اس لئے اس کے حسن اور خوبیوں کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔"

بالکل سامنے کی بات ہے کہ انگریزی زبان سے نابلد ایک شخص کیا شیکسپیر کے ڈراموں کی فنی خوبیوں، اس کی زبان کے حسن اور اس کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز ہے؟ وہ غریب تو انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتا پھر اسے اس زبان کے اسرار و رموز کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بالکل اسی طرح کارلائل اور ان کے ہم وطن جو عربی زبان کی ابجد سے بھی واقف نہیں کیسے اندازہ اور فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس میں فصاحت و بلاغت ہے یا نہیں؟ اس میں ربط و تسلسل کا فقدان ہے یا یہ خوبیاں بدرجہ کمال موجود ہیں؟ اس کا اندازہ کرنا ہے تو ان عربوں سے پوچھئے جن کی زبان میں یہ نازل ہوا تھا، ان سے معلوم کیجئے جو حاملِ قرآن صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سخت مخالف اور ناقد تھے پھر دیکھئے کہ قرآن اور حاملِ قرآن کے سخت مخالف اور دشمن ہونے کے باوجود وہ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ یہ وہ لوگ تھے جو خود کو اہل زبان اور اپنے علاوہ ساری دنیا کو "عجمی"

یعنی گونگا کہتے تھے، جو اپنے سوائے کسی کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔

مکہ کے ان فصیح و بلیغ اور دانشور لوگوں میں عتبہ بن ربیعہ، نضر بن حارث، ولید بن مغیرہ، خالد بن عقبہ اور حکیم ضماد وہ بڑے نام ہیں جن میں سے بعض کے سامنے تو سارا عالم عرب سر عقیدت خم کرتا تھا۔

عتبہ بن ربیعہ کا خراج تحسین

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قریش مکہ کے یہی اکابر جو اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی کمال کی انتہا کو چھو رہے تھے حضورؐ اقدس اور آپؐ پر نازل ہونے والے قرآن کے سامنے سر عقیدت خم کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ جب قریش نے دیکھا کہ مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور حضورؐ اقدس کی مقبولیت بڑھتی چلی جا رہی ہے تو ایک روز مکہ کا ممتاز رئیس اور دانشور عتبہ بن ربیعہ قریش کے سرداروں سے مشورہ کرنے کے بعد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یوں گویا ہوا:

> اے میرے بھتیجے! تم اس قومی رشتے سے بخوبی واقف ہو جو تمہارے اور ہمارے درمیان ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہاری لائی ہوئی چیز (دعوت اسلام) نے قوم میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ تم ہمارے باپ دادا کو جاہل کہتے ہو، ہمارے دین میں عیب نکالتے ہو (اس جھگڑے کو ختم کرنے کی غرض سے) میں تمہارے سامنے چند تجویزیں پیش کرتا ہوں ان پر غور کرو شاید ان میں سے کوئی بات تمہیں پسند آ جائے۔ اس کے بعد عتبہ نے اس مسئلے یا تنازعے کے حل کی غرض سے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں۔

''تم نے نبوت کا دعویٰ اگر اس لئے کیا ہے کہ اس ذریعے سے بہت سی دولت اکٹھی کر کے مکہ کے مال دار ترین شخص بن جاؤ یا اس سے تمہارا مقصد سرداری حاصل کرنا ہے یا تم بادشاہ بننا چاہتے ہو تو (اے میرے بھتیجے!) یہ سب چیزیں ہم خود تمہارے لئے مہیا کر سکتے ہیں یعنی اتنا مال و دولت دے دیں گے کہ تم مکہ کے امیر ترین شخص ہو جاؤ گے' اپنا سردار بھی بنا لیں گے اور اگر خواہش کرو گے تو تمہیں بادشاہت بھی دلوا دیں گے لیکن اگر ان میں سے کوئی بات نہیں اور تم پر کسی جن یا آسیب کا سایہ ہے تو کسی اچھے حکیم کو بلا کر ہم اپنے خرچ پر تمہارا علاج کرائیں گے یہاں تک کہ تم بالکل تندرست ہو جاؤ گے''

جب عتبہ گفتگو ختم کر چکا تو حضورؐ اقدس نے فرمایا: ''اے ابوالولید! (یہ عتبہ کی کنیت تھی) تمہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے' اب جو کچھ میں کہتا ہوں وہ سنو۔'' اس کے بعد آپؐ نے قرآن شریف کی سورہ حم سجدہ کی ابتدائی آیات مقام سجدہ تک تلاوت فرمائیں۔ عتبہ حیرت و استعجاب کے عالم میں قرآن شریف سن رہا تھا' اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت کی جانب زمین پر رکھے ہوئے تھے۔ جب سجدہ کا مقام آیا اور حضورؐ اقدس سجدے سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ: ''اے ابوالولید تم نے اپنی باتوں کا جواب سن لیا اب تمہیں اپنے معاملے کا اختیار ہے۔''

عتبہ حضورؐ اقدس کے پاس سے اٹھ کر جب قریش کی مجلس میں واپس آ رہا تھا تو ان میں سے بعض سرداروں نے کہا کہ ''دیکھو عتبہ جس چہرے سے (محمدؐ کے پاس) گیا تھا یہ اس چہرے کے ساتھ واپس نہیں آ رہا ہے۔'' پھر انہوں نے عتبہ سے پوچھا کہ ''کہو کیا ماجرا گذرا'' عتبہ نے جواب دیا کہ:

''اے سرداران قریش! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ (محمدؐ سے) ایسی باتیں سن کر آ رہا ہوں جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ (محمدؐ کا کلام) یعنی قرآن نہ تو شاعری ہے' نہ یہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں' نہ یہ سحر (جادو) ہے۔ اے سرداران قریش تم میری بات مان لو اور محمدؐ کو اس کے حال پر چھوڑ دو' جو باتیں میں اس سے سن کر آیا ہوں انہیں ساری دنیا میں پھیلنے سے کوئی روک نہیں سکے گا اس لئے تم ان کی مخالفت نہ کرو۔''

عتبہ کی گفتگو سن کر سرداران قریش بولے ''اے ابوالولید! خدا کی قسم محمدؐ نے تم پر بھی جادو کر دیا ہے۔'' (۱)

یہ تھا قرآن کا اعجاز جو دوست تو دوست دشمنوں سے بھی اپنے کمال کا لوہا منوا لیتا تھا۔

نضر بن حارث کا خراج تحسین

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اسی مورخ نے بیان کیا ہے جو حضورؐ اقدس کا دوسرا سب سے بڑا سیرت نگار تھا یعنی ابن ہشام۔ یہ واقعہ نضر بن حارث کا ہے۔ یہ نضر مکہ کا بڑا سردار اور حضورؐ اقدس کا سخت ترین مخالف بلکہ دشمن تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ ''قرآن جیسا کلام میں بھی بنا سکتا ہوں۔'' اسے فن شعر پر بھی غیر معمولی عبور حاصل تھا مگر جب اس نے خالی الذہن ہو کر خود قرآن سنا تو اس کے دل کی حالت ہی بدل گئی۔ چنانچہ ایک روز وہ قریش کی مجلس میں اچانک کھڑا ہو گیا جہاں

---

(۱) السیرۃ النبویہ لابن ھشام الجزء الاول ص ۳۱۳ و ۳۱۴ مصطفیٰ البابی الحلبی بمصر ۱۳۰۰ھ/۱۹۳۶م

ابو جہل بھی موجود تھا اور یوں گویا ہوا:

"اے جماعتِ قریش! تم میں ایک امرِ عظیم نازل ہوا ہے جسے دور کرنے کی تم لاکھ کوشش کرو کامیاب نہیں ہو سکتے (یہ امر عظیم محمدؐ کا معاملہ ہے) کہ جب وہ تمہارے درمیان ایک نوجوان کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا تو تم اسے صادق اور امانت دار کہتے تھے لیکن جب وہ پختہ عمر کو پہنچا اور تمہارے پاس وہ چیز (قرآن) لایا (جسے تم ناپسند کرتے ہو) تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ ساحر (جادوگر) ہے۔ خدا کی قسم محمدؐ ہرگز جادوگر نہیں۔ ہم نے جادوگروں کو دیکھا ہے' ان کے جادو کرنے کے عمل (طریقوں) اور جادو کرتے ہوئے جو بول وہ پڑھتے ہیں ہم نے ان کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ پھر تم نے کہا کہ یہ کاہن ہے تو خدا کی قسم محمدؐ کاہن بھی نہیں ہو سکتا' ہم کاہنوں کو جانتے ہیں' ان کی حالت اور ان کی کہانت کے طور طریقوں سے خوب واقف ہیں۔ پھر تم نے کہا کہ محمدؐ شاعر ہے تو خدا کی قسم شعر کی مختلف اصناف' اس کی بحور مثلاً "ہزج" اور "رجز" وغیرہ سے بھی بخوبی واقف ہیں (اس لئے محمدؐ شاعر بھی نہیں ہو سکتا) پھر تم نے کہا کہ محمدؐ جنون کے مرض میں مبتلا ہے تو خدا کی قسم وہ مجنون بھی نہیں کیونکہ جس شخص پر آسیب وغیرہ کا سایہ ہو اس کی ساری علامات کا ہمیں علم ہے۔ پس اے جماعت قریش تم اپنے بارے میں غور و فکر سے کام لو (یعنی اپنے طرز عمل کا جائزہ لو) خدا کی قسم تمہارے پاس (قرآن کی صورت میں) ایک امر عظیم آیا ہے۔"(۲)

اندازہ کیجئے کہ وہ نضر بن حارث جو حضورؐ اقدس کا شدید ترین دشمن تھا اور آپؐ کے مقدس مشن کو ناکام بنانے کے درپے رہتا تھا' جو آیات قرآنی جیسی آیات بنا لینے کا دعویٰ کرتا تھا' وہ آیات قرآنی کا جواب تو کیا لاتا قرآن سن کر نہ صرف اس کی عظمت اور اعجاز کا قائل ہو گیا بلکہ خود صاحب قرآن کے بارے میں بھی اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ایک امر عظیم لے کر آیا ہے ہمیں اس کی مخالفت سے باز آ جانا چاہئے۔

مکہ کے دو بڑے سرداروں اور دانشوروں نے جو حضورؐ اقدس کے شدید ترین دشمن تھے' قرآن اور صاحب قرآن کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ قرآن کی تاثیر کا کیا عالم تھا اور اس نے دلوں میں بلکہ سنگ جیسے دلوں میں کیا انقلاب برپا کر دیا تھا؟ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ فہرست خاصی طویل ہے۔ مکہ میں کچھ اور سربر آوردہ لوگ کچھ اور عظیم دانشور اور کچھ اور صاحب کمال شاعر تھے کہ فصاحت و بلاغت جن کے گھر کی لونڈیاں اور باندیاں تھیں' انہوں نے بھی حضورؐ اقدس کی شدید مخالفت کے باوجود برملا اعتراف کیا کہ قرآن کا مثل لانا ممکن ہی نہیں اور صاحب قرآن کی صورت میں جو عظیم ہستی ہمارے درمیان جلوہ افروز ہوئی ہے اس کی عظمت کو سلام' اس کی تھوڑی سی تفصیل!

جب قریش نے دیکھا کہ ان کی کوششوں کے باوجود آنحضورؐ کی مقبولیت میں

---

(۲) السیرة النبویه لا بن هشام الجزء الاول ص ۳۲۰ مطبعة مصطفیٰ البابی الحلبی بمصر ۱۳۰۰ھ/۱۹۳۶م

اضافہ ہو رہا ہے اور مکہ میں آنے والے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں تو ایک روز سرداران قریش سر جوڑ کر بیٹھے اور مشورہ کرنے لگے کہ مکہ میں آنے والوں کو آنحضورؐ سے برگشتہ کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے تاکہ لوگ آپؐ کی طرف متوجہ ہی نہ ہوں۔ ان سرداروں میں ابولہب اور ولید بھی شامل تھے۔

ولید کا خراج تحسین

مختلف سرداروں نے مختلف آراء کا اظہار کیا۔ کسی نے کہا کہ ہم کہا کریں گے کہ یہ تو ایک دیوانہ آدمی ہے اس کی باتوں کا کیا اعتبار، دوسرا بولا کہ ہم کہیں گے کہ وہ تو ایک کاہن ہے اور بس، تیسرا بولا کہ کہنا یہ چاہئے کہ یہ تو شاعر آدمی ہے۔ چوتھا یوں گویا ہوا کہ نہیں اس کے بارے میں ہمیں کہنا چاہئے کہ محمدؐ تو ایک ساحر ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ یہ آراء سن کر ولید نے جو مکہ کا بہت بڑا سردار اور دانشور تھا جواب دیا کہ:

> "باہر سے آنے والوں کے سامنے ہمیں ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں جن سے لوگوں کو ہمارے بارے میں جھوٹے ہونے کا گمان گزرے۔ محمدؐ نہ کاہن ہے نہ جادوگر ہے نہ دیوانہ ہے اور نہ شاعر ہے۔ میں نے بہت سے کاہنوں کو دیکھا ہے ان کی تک بندیوں کو محمدؐ کے کلام سے کیا نسبت؟ یا شاعروں کے کلام کو محمدؐ کے کلام سے کیا علاقہ۔ "محمدؐ کا کلام تو اپنے اندر کھجور کی سی حلاوت رکھتا ہے۔ اس کی گفتگو تو بہت ہی رسیلی اور پر تاثیر ہوتی ہے۔ اس کی باتیں سن کر باپ بیٹے کو، شوہر بیوی کو اور بھائی بھائی کو چھوڑ دیتا ہے"(۳)

عرب کے اس عظیم دانشور اور فن شعر کے عالم نے جو اپنی قوم کا مرکزِ عقیدت تھا حضورؐ اقدس کو اور آپؐ پر نازل ہونے والی وحی کو جن الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ان پر غور تو کیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ محمدؐ ایسا کلام پیش کرتا ہے جسے سن کر باپ بیٹے سے، شوہر بیوی سے اور بھائی بہن سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ دنیا میں تین ہی رشتے مقدس ترین اور مضبوط ترین ہوتے ہیں جنہیں توڑا نہیں جا سکتا مگر ولید کہتا ہے کہ محمدؐ کی وحی ایسی پر تاثیر اور پر حکمت ہے کہ سننے والا اسے سن کر اور قبول کر کے اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی بچوں تک کو قربان کر دیتا ہے یعنی جہاں وحی الٰہی کا ان عزیز ترین رشتوں سے تصادم ہوتا ہے وہاں حضورؐ اقدس پر ایمان لانے والے وحی الٰہی کی اتباع کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اگر انہیں اپنے والدین، بیوی بچوں اور بھائی بہنوں سے ہاتھ دھونا پڑیں تو وہ اس قربانی سے قطعاً دریغ نہیں کرتے۔

اگر قرآن کی باتیں غیر فصیح ہوتیں، اگر ان میں ربط نہ ہوتا، حکمت و دانائی نہ ہوتی تو عرب کے سخت گیر قریش اور اکھڑ مزاج لوگ کبھی ان سے متاثر نہ ہوتے، انہیں کبھی قبول نہ کرتے اور ان پر کبھی ایمان نہ لاتے۔ ولید بن مغیرہ جیسے عرب دانشور کے بقول رسولؐ اقدس پر نازل ہونے والے کلام میں ایسی بے مثال تاثیر ایسی حیرت انگیز معقولیت اور ایسی حکیمانہ کشش تھی کہ لوگ اس کے گرویدہ ہو کر اس کی خاطر اپنی زندگی کی بڑی سے بڑی متاعِ عزیز قربان کر دیتے تھے۔

---

(۳) السیرة النبویہ لابن هشام الجزء الاول ص ۲۸۹ مطبعة مصطفی البابی الحلبی بمصر (ھ۔۱۹۳۶ء)

خالد بن عقبہ کہتا ہے

خالد بن عقبہ زمانہ جاہلیت میں حضورؐ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ اے محمدؐ! مجھے قرآن میں سے کچھ سناؤ۔ حضورؐ اسے سورۃ النحل کی چند آیات سناتے ہیں۔ خالد وحی الٰہی سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

"اے محمدؐ ایک بار پھر پڑھو!" حضورؐ پھر تلاوت فرماتے ہیں ---- اور خالد بن عقبہ کی زبان پر قرآن حکیم کی تعریف میں یہ اشعار برجستہ جاری ہو جاتے ہیں۔

وَاللّٰہِ اِنَّ لَہٗ لَحَلَاوَۃً   وَاَنَّ عَلَیْہِ لَطَلَاوَۃً
وَ اِنَّ اَوَّلَہٗ لَمُغْدَقٌ   وَاِنَّ آخِرَہٗ لَمُثْمِرٌ
وَمَا یَقُوْلُ ھٰذَا الْبَشَرُ (۴)

یعنی خدا کی قسم (اس) کلام میں عجیب شیرینی ہے اور یہ اپنی تروتازگی میں بھی عجیب تر ہے۔ اس کا آغاز سیرابی ہے اور اس کا آخر پھلوں کی کثرت ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا کلام انسان تخلیق کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد خالد بن عقبہ اسلام قبول کر کے حضورؐ اقدس کے غلاموں میں شامل ہو جاتا ہے۔

اندازہ کیجئے کہ وہ خالد بن عقبہ جو بزعم خود فصحائے عرب میں سے تھا اور حضورؐ کو "محمدؐ" کہہ کر مخاطب کرتا ہے جیسے وہ آپؐ کا ہم مرتبہ ہو۔ خالد بن عقبہ وحی الٰہی سن کر اسے دوبارہ سنانے کی فرمائش کرتا ہے اور پھر اسے ایسا کلام قرار دیتا ہے جو انسان کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ وہ قرآن کو ایسے شجر ثمردار سے تشبیہ دیتا ہے جس کی

---

(۴) "اسد الغابہ" جلد ثانی ص ۹۰ مولفہ ابن اثیر۔ مطبوعہ بیروت

جڑیں ہمہ وقت غذا حاصل کرتی رہتی ہیں اور جس کی شاخیں ہر موسم میں پھلوں سے لدی رہتی ہیں۔ آخر میں وہ اس تعریف کو بھی ناکافی سمجھتا ہے اور یہ کہہ کر اپنے عجز کا اعتراف کر لیتا ہے کہ ع

"وَمَا یَقُوْلُ ھٰذَا الْبَشَرُ"

یعنی سچ تو یہ ہے کہ ایسا کلام لکھنے سے انسان عاجز آ جاتا ہے اور یہ کلام انسان کا نہیں ہو سکتا۔

حکیم ضماد کا اعتراف عجز

عرب کا مشہور حکیم ضماد ازدی ایک روز مکہ آیا۔ اسے بعض نادان لوگوں نے بتایا کہ (نعوذ باللہ) "محمدؐ کو جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے"۔

یہ سن کر ضماد نے کہا اچھا میں انہیں دیکھتا ہوں، کیا عجب اللہ تعالیٰ انہیں میرے ہاتھ سے شفا بخش دے۔ چنانچہ وہ آپؐ سے ملا اور کہا کہ میں جنون کا علاج کرتا ہوں اللہ جس کو چاہتا ہے اسے میرے ذریعے شفا بخش دیتا ہے تو کیا آپؐ چاہتے ہیں (کہ میں آپؐ کا علاج کر دوں) ضماد کی گفتگو سن کر حضورؐ نے فرمایا:

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا
مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ
اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ
وَرَسُوْلُہٗ اَمَّا بَعْدُ۔

یعنی تمام تعریفوں کا اللہ تعالیٰ ہی مستحق ہے میں اسی کی حمد کرتا اور اسی کی مدد چاہتا ہوں، جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے دے اسے کون گمراہ کر سکتا ہے اور جسے اللہ (اس کی بد اعمالیوں کی وجہ سے) گمراہوں میں شامل کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے، اور شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے اور کوئی معبود نہیں وہ واحد و

یگانہ ہے، اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔" (اے ضماد) اب کہو جو کچھ کہنا ہے۔

حضورؐ اقدس کی زبان مبارک سے یہ کلام سن کر حکیم ضماد حیرت زدہ رہ گیا اور بولا اے محمدؐ! ایک مرتبہ پھر پڑھو۔ حضورؐ اقدس نے ان الفاظ کا پھر اعادہ کیا۔ تیسری بار ضماد نے پھر فرمائش کی کہ اے محمدؐ ایک بار اور پڑھ دو۔ جب تیسری بار آپؐ نے یہ پر تاثیر الفاظ ادا کئے تو حکیم ضماد بے ساختہ بول اٹھا کہ:

> لَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْكَهَنَةِ وَ قَوْلَ السَّحَرَةِ وَ قَوْلَ
> الشُّعَرَاءِ فَمَا سَمِعْتُهُ مِثْلُ كَلِمَتِكَ الخ (۵)

(یعنی میں نے کاہنوں کی باتیں بھی سنی ہیں، ساحروں کے ساحرانہ کلمات بھی سنے ہیں، شاعروں کا کلام بھی سنا ہے مگر (اے محمدؐ! سچ یہ ہے کہ) تمہارے ان کلمات جیسا کلام آج تک کبھی نہیں سنا اور اس کلام نے تو بلاغت کی آخری حد کو چھو لیا ہے۔ اسکے بعد حکیم ضماد نے حضورؐ کے دست مبارک پر بیعت کرلی۔ ع

شکار کرنے کو آئے، شکار ہو کے چلے

اندازہ کیجئے کہ عرب کا یہ حکیم و دانشور جو حضورؐ کو جنون کا مریض سمجھ کر شفا یاب کرنے آیا تھا خود آپؐ کے بیمارانِ محبت میں شامل ہو گیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ آپؐ کا کلام بلاغت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ کوئی کاہن، کوئی ساحر کوئی شاعر آپؐ کے مرتبے کی گرد کو نہیں پا سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ جو بلاغت آپؐ کے کلام میں ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ کاہن، ساحر اور شاعر سے ماورا کوئی ہستی ہیں۔ فراموش نہ کیا جائے کہ حضورؐ اقدس نے حکیم ضماد کو مخاطب کرتے ہوئے

---

(۵) الجامع الصحیح المسلم۔ الجزء الثالث ص ۱۲، دار الفکر۔ بیروت، لبنان۔

جو کچھ کہا تھا وہ خدا کا کلام نہیں تھا، وہ وحی الٰہی نہیں تھی، آیات قرآنی نہیں تھیں بلکہ حضورؐ کے اپنے الفاظ تھے، آپؐ کا اپنا کلام تھا جسے سن کر وہ مبہوت رہ گیا جب اس نے خدا کا کلام سنا ہو گا تو اس کے احساسات کیا ہوں گے افسوس کہ وہ ریکارڈ نہیں ہو سکے۔

لبید کی ترک شعر گوئی

تاریخ ادب عربی کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ لبید بن ربیعہ کتنا بڑا شاعر اور اہل مکہ کا کتنا سربر آوردہ شخص تھا۔ لبید پر قرآن کی عظمت، اس کی حکمت و دانائی اور اس کی اثر انگیزی کا سکہ اس حد تک بیٹھ چکا تھا کہ اس نے شاعری ہی کو حقیر جانا۔ لبید کے سامنے عرب کے سارے شاعروں کا بے نظیر کلام موجود تھا، وہ فن شعر کی باریکیوں سے آگاہ تھا، اس کا پورا رموز داں تھا، خود اس کا اپنا ذخیرہ شعر کیا کم تھا مگر اس کے باوجود وہ قرآن سے اس حد تک مسحور ہو چکا تھا کہ ایک روز جب حضرت عمرؓ نے اس سے خواہش ظاہر کی کہ اپنا کلام سنائے تو اس نے جواب دیا:

> "جب سے مجھے اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرا اور سورہ آل عمران کا علم
> عطا کیا ہے اس کے بعد میں نے شعر کہنا ترک کر دیا" (۶)

گویا لبید بن ربیعہ کہہ رہا تھا کہ شاعر خواہ اظہارِ بیان اور اسلوبِ ادا کے کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے اور شاعری کمالاتِ فن کی انتہائی معراج حاصل کر لے لیکن رسول کریمؐ پر نازل ہونے والی وحی سے اسے کیا نسبت؟ جو خوبیاں قرآن مجید میں ہیں، جن کمالات سے وحی رسولؐ مزین و آراستہ ہے شاعری ان تک کہاں پہنچ سکتی ہے؟ کیونکہ شعر انسان کا کلام ہے اور قرآن خالقِ انسان کا کلام جو فرق خدا اور بندے میں ہے وہی فرق شاعری اور قرآن میں ہے۔

---

(۶) اسد الغابہ فی معرفت الصحابہ مولفہ ابن اثیر جلد چہارم ص ۲۴۶ (بیروت)

اب دیکھئے ایک طرف عربی زبان سے نابلد کارلائل صاحب ہیں جن کا اعتراض ہے کہ قرآن کو فصیح و بلیغ کتاب نہیں کہا جا سکتا۔ دوسری طرف عرب کے وہ فصحاء ہیں جن کے سامنے فصاحت و بلاغت دست بستہ کھڑی رہتی تھی، جو عربی ادب کے امام تھے ان میں بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو ابھی اسلام بھی نہیں لائے تھے بلکہ حضورؐ اقدس کے سخت مخالف اور ناقد تھے ان کا فیصلہ ہے کہ:

> "قرآن جیسا کلام لکھنے سے انسان عاجز آ جاتا ہے، یہ تو انسان کا کلام ہو سکتا ہی نہیں۔"

تکرار کا اعتراض

کارلائل کا قرآن پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں تکرار بہت ہے۔ ایک ہی بات کو بار بار بیان کرنے سے اس کا لطف ختم ہو گیا ہے۔

افسوس کہ کارلائل نے انجیل مقدس پر غور نہیں کیا۔ اگر کسی بات کا بار بار بیان کرنا محل اعتراض ہے تو یہ اعتراض انجیل پر بھی وارد ہوتا ہے۔ کسی ایک انجیل کو لے لیجئے، اس میں ایک ہی بات کو بیس بیس بار بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "خدا کی بادشاہت" یا "آسمان کی بادشاہت۔" چاروں انجیلوں میں اس بادشاہت کا بہت ہی تواتر سے ذکر کیا گیا ہے اور بعض دفعہ تو ایک ہی صفحے پر آٹھ آٹھ بار اس کا ذکر ہے چند مقامات دیکھئے۔

خدا کی بادشاہی

"خدا کی بادشاہی تمہاری ہے۔" (۷)

"لیکن جو خدا کی بادشاہی میں چھوٹا ہے۔" (۸)

"خدا کی بادشاہی کی خوشخبری سناتا ہوا۔" (۹)

"خدا کی بادشاہی کی منادی۔" (۱۰)

خدا کی بادشاہی کی منادی (۱۱)

خدا کی بادشاہی کی خبر پھیلا (۱۲)

خدا کی بادشاہی تمہارے نزدیک آ پہنچی ہے (۱۳)

خدا کی بادشاہی نزدیک آ پہنچی ہے (۱۴)

خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آ پہنچی (۱۵)

خدا کی بادشاہی کس کی مانند ہے؟ میں اس کو کس سے تشبیہ دوں؟ (۱۶)

اس نے پھر کہا "میں خدا کی بادشاہی کو کس سے تشبیہ دوں" (۱۷)

خدا کی بادشاہت کی خوشخبری دی جاتی ہے (۱۸)

آپ نے دیکھا! یہ صرف ایک انجیل یعنی "لوقا" کے چند مقامات ہیں جن میں ایک ہی بات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے ورنہ اس قسم کی تکرار سے انجیل بھری پڑی ہے۔

گم شدہ بھیڑیں

اسی طرح ایک اور موضوع "گم شدہ بھیڑیں" ہے۔ یہ موضوع بھی ایک ہی

---

(۷) لوقا کی انجیل باب ۶ آیت ۲۱

(۸) لوقا کی انجیل باب ۷ آیت ۲۸

(۹) لوقا کی انجیل باب نمبر ۸ آیت ۱

(۱۰) لوقا کی نجیل باب ۹ آیت ۲

(۱۱) لوقا کی انجیل باب ۹ آیت ۱۲

(۱۲) لوقا کی انجیل باب ۹ آیت ۶۱

(۱۳) لوقا کی انجیل باب ۱۰ آیت ۹

(۱۴) لوقا کی انجیل باب ۱۰ آیت ۱۲

(۱۵) لوقا کی انجیل باب ۱۱ آیت ۲۰

(۱۶) لوقا کی انجیل باب ۱۳ آیت ۱۸

(۱۷) لوقا کی انجیل باب ۱۴ آیت ۲۰

(۱۸) لوقا کی انجیل باب ۱۵ آیت ۱۶

انجیل میں اور قریب قریب ایک ہی جیسے الفاظ میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

> ”(صرف) اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے
> پاس جانا“ (۱۹)
> ”میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور
> کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا“ (۲۰)۔
> ”ابن آدم کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈنے اور نجات دینے آیا ہے
> ---- اگر کسی آدمی کی سو بھیڑیں ہوں اور ان میں سے ایک
> بھٹک جائے تو کیا وہ ننانوے کو چھوڑ کر اور پہاڑوں میں جا کر اس
> بھٹکی ہوئی کو نہیں ڈھونڈے گا“ (۲۱)
> ”اسی طرح میں اپنی بھیڑوں کو جانتا ہوں اور میری بھیڑیں مجھے
> جانتی ہیں ---- اور میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ
> خانے کی نہیں مجھے ان کو بھی لانا ضرور ہے“ (۲۲)
> ”میری بھیڑیں میری آواز سنتی ہیں اور میں انہیں جانتا ہوں اور
> وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہیں“ (۲۳)

اب اگر کوئی نادان انجیل پر اعتراض کرے کہ اس میں ایک ہی بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے اور اس تکرارِ مضمون نے اس کا لطف ختم کر دیا ہے تو یہ اس کی کوتاہی

---

(۱۹) متی کی انجیل باب ۱۰ آیت ۶
(۲۰) متی کی انجیل باب ۱۵ آیت ۲۴
(۲۱) متی کی انجیل باب ۱۸ آیت ۱۱-۱۲
(۲۲) یوحنا کی انجیل باب ۱۰ آیت ۱۵-۱۶
(۲۳) یوحنا کی انجیل باب ۱۰ آیت ۲۷

فہم ہی کہلائے گی۔ خدا کے نبی لوگوں سے صرف ایک بار تو خطاب نہیں کرتے‘ ان کے مخاطب بھی ہمیشہ ایک ہی تو نہیں ہوتے‘ ان کے مخاطب ایک ہی گاؤں‘ ایک ہی محلے یا ایک ہی شہر میں تو نہیں رہتے۔ خدا کے نبی مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے ملتے ہیں۔ مختلف مواقع پر نصائح کرتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کا خطاب ان کے سارے مخاطبین تک پہنچ جائے اس لئے انہیں ایک ہی بات کو بار بار بیان کرنا پڑتا ہے۔ اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں بھی ایک ہی مضمون کو بار بار بیان کیا گیا کیونکہ حضور اقدسؐ نے اپنے ۲۳ سالہ دور نبوت میں ہزاروں ہزار افراد سے خطاب فرمایا‘ مختلف مواقع پر خطاب فرمایا‘ مخالفین نے مختلف مواقع پر سوالات کئے‘ آپؐ پر اور آپؐ کے منصب نبوت پر اعتراضات کئے ان کے اعتراضات کا اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے جواب دیا۔ مختلف مواقع پر اور مختلف مخالفین کے اعتراضات اور شبہات کے جواب میں نازل ہونے والی وحی کو یک جا کر کے اعتراض کرنا کہ دیکھو ایک ہی بات کو قرآن نے اتنی بار بیان کیا غلط اور ضعیف البنیاد اعتراض ہے۔

قرآن کا نازل کرنے والا خدا عالم الغیب ہے‘ اسے معلوم تھا کہ اس کے کلام پر یہ اعتراض بھی کیا جائے گا کہ اس میں ایک ہی بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے اس لئے اس نے اسی وقت اس اعتراض کا ازالہ کر دیا چنانچہ فرمایا کہ:

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ
لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ (الانعام آیت ۱۰۵)

یعنی ہم آیات کو بار بار اور مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں تاکہ (اے رسولؐ آپ) اسے سب لوگوں تک پہنچا دیں اور تاکہ انہیں کہنا پڑے کہ تو نے ہمیں (اچھی طرح) پڑھ کر سنا دیا اس طرح جو دانشمند اور علم والے لوگ ہیں ان پر

یہ اچھی طرح ظاہر ہو جائے۔

آگے چل کر پھر فرمایا کہ:

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِیَذَّکَّرُوۡا ۔ الخ (بنی اسرائیل۔۴۱)

(اور ہم نے اس قرآن پاک میں (ایک بات' کو بار بار اس لئے بیان کیا ہے تا کہ یہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں)

گویا قرآن کریم نے تکرار مضمون کے اعتراض کا خود ہی مسکت جواب دے دیا۔ اللہ تعالیٰ کا جواب یہ ہے کہ اے نادانو! ہمارے پاس اقوالِ حکمت و دانائی کی کمی نہیں ہم تو لازوال سرچشمہ ء حکمت کے مالک ہیں۔ ہم نے ایک ہی بات کو بار بار اس لئے بیان کیا ہے تاکہ ہمارا رسول: "اسے سب لوگوں تک پہنچا دے"۔

گویا ایک ہی بات کو بار بار بیان کرنے میں اصل حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام ان تمام لوگوں تک پہنچ جائیں جو حضورؐ اقدس کے مخاطب تھے اور مختلف اوقات میں، مختلف مقامات پر آپؐ سے ملتے تھے۔ آپؐ سے سوالات کرتے تھے، اپنے شبہات کا اظہار کرتے تھے۔ آپؐ کو انہیں جواب دینا اور مطمئن کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح ایک ہی بات بار بار بیان ہوتی تھی کیونکہ مخاطب جو الگ الگ ہوتے تھے۔ اس تکرار مضمون میں دوسری حکمت یہ تھی کہ بقول قرآن:

> "لوگ کہہ اٹھیں کہ (اے خدا کے رسول) آپؐ نے ہمیں اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا۔ اس طرح ان پر حجت تمام ہو جائے"

حجت اسی طرح تمام ہو سکتی تھی کہ حضورؐ کے زمانے کے تمام مخاطبین تک اللہ کا کلام پہنچ جائے اور وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ اے رسولؐ! آپ نے احکام الٰہی کو بار بار بیان کر کے ان کا ہر پہلو ہم پر واضح کر دیا اور آپؐ کی بات کسی پہلو سے ہم پر مشتبہ نہیں رہی۔

قرآن کی جنّت

ایک شخص ساری زندگی زناکاری کرتا رہا، شراب پیتا رہا، ڈاکے مارتا رہا، قتل کرتا رہا اور طبعی عمر گزار کر فوت ہو گیا۔ ایک اور شخص نے ساری زندگی نیکی و پرہیزگاری میں گزاری، اس کے ہاتھ یا زبان سے کسی کو دکھ نہیں پہنچا، اس کا دامن کسی گناہ سے آلودہ نہیں ہوا، اس نے دنیا سے کچھ حاصل بھی نہیں کیا اور نہایت عسرت و تنگ دستی کی زندگی گزار کر فوت ہو گیا، مرنے کے بعد کیا دونوں سے ایک جیسا سلوک ہو گا؟ انصاف کا تقاضا کیا ہے؟

اس کا سیدھا اور مطابق عقل جواب یہی ہے کہ ظالم اور بدکار شخص کو سزا دی جائے گی اور نیک و پرہیزگار شخص کو اس کے نیک اعمال کا اجر دیا جائے گا؟ اس میں کوئی بات نہ تو انصاف کے خلاف ہے نہ عقل کے خلاف ہے۔ یہی اسلام کی جہنم اور جنت ہے، مگر اس کے باوجود کارلائل نے یہ حکم لگا دیا کہ:

> "اسلام جس جنت کا تصور پیش کرتا ہے اس میں حیوانیت پائی جاتی ہے جو ہمارے روحانی احساسات کو بری طرح مجروح کرتا ہے۔"

شاید کارلائل کے سامنے قرآن شریف کے درج ذیل مقامات تھے جن کی حقیقت کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکا۔

(ا) اور جو لوگ (اللہ اور اس کے رسولؐ پر) ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال بھی سرانجام دیئے انہیں ایسے باغوں میں داخل کیا جائے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ (البقرہ۔۲۵)

(۲) جنت میں شہد، دودھ اور شراب کی نہریں جاری ہوں گی۔ (سورۃ محمد۔ ۱۵)

(۳) کھجوروں، اناروں اور انگوروں کے باغات ہوں گے۔ (سورۃ رحمان۔ ۳۳)

(۴) قالین اور گدے بچھے ہوئے ہوں گے۔ (سورۃ غاشیہ۔ ۱۵، ۱۶)

(۵) ہم عمر نوجوان عورتیں عطا کی جائیں گی۔ (سورۃ رحمٰن۔ ۶۸)

(۶) (یہ عورتیں) بڑی بڑی آنکھوں والی حسین و جمیل اور حیادار ہوں گی۔ (سورۃ صافات۔ ۴۸، ۴۹)

(۷) جنہیں نہ انسانوں نے چھوا ہو گا نہ جنوں نے۔ (سورۃ رحمان۔ ۵۶)

(۸) (جنتیوں کے لئے) سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار ہوں گے۔ (سورۃ کہف۔ ۳۱)

(۹) دل پسند پرندوں کا گوشت دیا جائے گا۔ (سورۃ واقعہ۔ ۲۱)

(۱۰) چھلکتے ہوئے پیالے ہوں گے۔ (سورۃ النبأ۔ ۳۴)

روحانیت کی غلط تعریف

اہل جنت کو عطا ہونے والی یہ نعمتیں کارلائل کے نزدیک حیوانی ہیں اس لئے وہ انہیں قابل اعتراض قرار دیتا ہے۔ حالانکہ ان میں کوئی بات حیوانی نہیں یہ تو انسان کی عین فطرتِ صحیحہ کے مطابق ہے۔ شدید گرمی کی حالت میں ریگستان کے درمیان سفر کرنے والے مسافر کو جو پیاس سے جاں بلب ہو رہا ہو اگر سرد اور شیریں پانی کا چشمہ مل جائے تو کیا اس کی زبان پر بے ساختہ الحمدللہ کے الفاظ جاری نہیں ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس انعام پر اس کا شکر ادا کرنا کیا حیوانیت قرار پائے گا؟ شدید بھوک کی حالت میں لذیذ اور مرغوب طبع غذا کا میسر آ جانا اور اس سے شکم سیر ہو کر کلمہ شکر ادا کرنا کیا حیوانیت ہے؟ پاکیزہ کردار نیک اطوار اور خوبرو دوشیزہ سے رشتہ ازدواج قائم کرنا کیا حیوانیت ہے؟ ایسا شخص کیا اپنی خوش نصیبی پر فخر نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے اس انعام پر سجدہ شکر ادا نہیں کرے گا؟ اس میں حیوانیت کی کون سی بات ہے؟ حیرت ہے جو امور اس دنیا میں حیوانیت قرار نہیں دیئے جا سکتے اور قابل اعتراض نہیں ٹھہرتے وہ جنت میں قابل اعتراض اور حیوانیت کیسے قرار پائیں گے؟ یہ کارلائل کی اپنی سوچ تھی اور بلاشبہ ناقص سوچ تھی۔

جنت کے پھل

کارلائل نے غور نہیں کیا کہ اہل ایمان اور صاحب کردار لوگوں سے جن انعامات کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ مادی نہیں خالص روحانی ہیں۔ جنت میں عطا ہونے والی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ نام محض اس لئے دیئے کہ انسان جنت میں ملنے والی نعمتوں کا حقیقی ادراک کر سکتا ہی نہیں۔ اس نے ان نعمتوں کو دیکھا ہی نہیں اس لئے وہ اس کے حاشیہ ء خیال میں کیسے آ سکتی ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ جس ملک میں آم پیدا نہ ہوتا ہو اور اس ملک کے ایک باشندے نے آم کبھی دیکھا بھی نہ ہو اسے آپ کس طرح بتائیں اور سمجھائیں گے کہ آم کیسا ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ آم سے ملتی جلتی کسی ایسی چیز کا آپ اس کے سامنے ذکر کریں گے جو اس نے دیکھی اور کھائی ہو تاکہ اس کا ذہن آم کی شکل و صورت اور اس کے ذائقے کی طرف کسی حد تک منتقل ہو سکے۔

بالکل یہی صورت یہاں ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں عطا کی جانے والی نعمتوں کی طرف رغبت دلانے کی غرض سے بطور مثال ان اشیاء کا ذکر کر رہا ہے جو انسان کے مشاہدے میں آتی رہتی ہیں اور جو اسے مرغوب خاطر ہیں۔ قرآن کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے اور ملک عرب میں پانی کی شدید قلت تھی، ہر طرف صحرا تھے، ریگستان تھے، چٹیل میدان تھے جہاں گھاس کا ایک تنکا نظر نہ آتا تھا، پانی اور سبزہ ان کے لئے بہت ہی بڑی نعمت تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ جنت کی طرف ان کی رغبت

دلانے کی خاطر فرماتا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ
جَنّٰتٍ الخ (النساء۔ ۵۷)

(اور جو لوگ (اللہ اور اس کے رسول پر) ایمان لے آئے اور (اس کے ساتھ ساتھ) انہوں نے نیک اعمال بھی سرانجام دیئے انہیں ہم ضرور ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی (اے لوگو!) اگر تمہیں باغات، فصلیں اور چشمے عزیز ہیں اور ایمان لانے اور مسلمان ہو جانے کی صورت میں ان سے محروم ہو جانے کا خطرہ محسوس کرتے ہو تو سنو! اس دنیا کی یہ نعمتیں اور آسائشیں تو چند روزہ ہیں، ایک دن تمہیں ان سے دست کش ہونا پڑے گا۔ آؤ! ہم تمہیں ایسے باغات اور ایسے چشموں کا پتا دیں جو تمہاری ذاتی ملکیت ہوں گے اور تم ان سے کبھی محروم نہ ہوگے۔ یہ باغات، یہ فصلیں، یہ پھل، یہ نہریں ان لوگوں کو عطا کی جائیں گی جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں گے اور حسن عمل جن کا سرمایہ ہو گا۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ باغات اور نہریں ہمارے ان مادی باغات اور مادی نہروں کی طرح ہوں گی۔ وہ باغات، ان کے پھل اور نہریں روحانی ہوں گی جن کی کیفیت ہمیں نہیں بتائی گئی کیونکہ ہم اسے سمجھ نہیں سکتے، وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، ہم نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ ان نعمتوں کی طرف ہمارے ذہن منتقل کرنے کی غرض سے باغوں، پھلوں اور نہروں کا ذکر کر دیا ورنہ یہ دنیاوی باغ، یہ مادی پھل اور یہ مادی نہریں ہرگز مراد نہیں۔

انسانوں کو اس دنیا میں پھل، گوشت، دودھ اور شہد مرغوب ہے اور عربوں کو

جو قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب تھے شراب بہت مرغوب تھی بلکہ ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی لیکن اس دنیا کے پھل، گوشت، دودھ اور شہد استعمال کرنے سے تو پیشاب آتا ہے، ایک دوسری "حاجت" بھی محسوس ہوتی ہے، شراب استعمال کرنے کے بعد انسان اول فول بکتا ہے۔ اگر جنت میں عطا ہونے والے پھل، دودھ، شہد اور گوشت بھی مادی ہو گا تو انسان کو وہاں بھی پیشاب آئے گا اور دوسری حاجت کے لئے بھی اسے جانا پڑے گا۔ کیا جنت کے پاکیزہ ترین ماحول کے ساتھ یہ ناپاک چیزیں کوئی مناسبت رکھتی ہیں؟ پس ثابت ہوا کہ یہ نعمتیں خالص روحانی ہوں گی چنانچہ فرمایا:

جنت کی شراب

یَتَنَازَعُوْنَ فِیْھَا کَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِیْھَا وَلَا تَاْثِیْمٌ ○
(الطور۔ ۲۳)

"(اور) وہاں یعنی جنت میں (اہل جنت خوش طبعی کے طور پر) شراب کے جام لیتے ہوئے ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی بھی کریں گے (مگر) اس میں نہ لغویات بکیں گے نہ کوئی اور گناہ ان سے (شراب پی کر) سرزد ہو گا۔"

اس آیت کریمہ نے سارے معاملے کا فیصلہ کر دیا اور ہمیں بتا دیا کہ جنت میں جن نعمتوں کا عطا ہونا بیان کیا گیا ہے وہ اس دنیا کی مادی نعمتیں ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو جنت میں بھی شراب پی کر نشہ ہو جاتا اور چونکہ وہاں کھلی ملے گی، عام ہو گی، پینے پر کوئی پابندی نہ ہو گی اس لئے میخوار اتنی پیئیں گے کہ مدہوش ہو کر جنت کی روشوں پر گر گر پڑیں گے، عالم مدہوشی میں اس قدر لغویات بکیں گے کہ خدا کی پناہ! اور عالم سرخوشی میں حوروں کی طرف دست درازی سے تو ہرگز باز نہیں آئیں گے

مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت میں جو شراب عطا ہوگی وہ نہایت پاکیزہ ہوگی جسے پی کر نشہ نہیں ہوگا اور نہ انسان لغویات بکے گا نہ کسی اور گناہ کا ارتکاب کرے گا پس ثابت ہوا کہ وہ شراب ہماری دنیا کی طرح مادی شراب نہیں ہوگی بلکہ وہ کوئی اور ہی چیز ہوگی، کوئی اور ہی نعمت ہوگی جس کی حقیقت ہم نہیں جانتے بلکہ جان سکتے ہی نہیں کیونکہ ہمارے مادی حواس ان غیر مادی اور روحانی چیزوں کا ادراک نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس شراب کے بارے میں ہمیں گومگو کی حالت میں نہیں چھوڑا بلکہ نہایت بلیغ اشارے کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا
كَافُوْرًا ○ (الدھر۔ ۵)

"یعنی جنت میں اللہ کے نیک بندوں کو ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں کافور کی خاصیت ہوگی۔"

گویا یہ شراب مدہوش کر دینے والی نہیں ہوگی بلکہ اس کے پینے سے انسان کے خیالات میں تغیر عظیم پیدا ہو جائے گا اور جس طرح کافور جسم کی رطوبتوں کو ختم کر دیتا ہے، غیر ضروری جوش کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور جرثوموں کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح ان پیالوں کے پینے سے انسان کے تمام برے خیالات کافور ہو جائیں گے اور وہ جنت میں رہنے کے قابل ہو جائے گا۔ پھر فرمایا:

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ○
(الدھر۔ ۱۷)

"یعنی جنتیوں کو ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں ادرک (سونٹھ) کی آمیزش ہوگی۔"

یہاں پھر اس امر کی نفی کر دی گئی کہ جنت میں جو شراب دی جائے گی وہ کوئی

نشہ آور چیز ہوگی بلکہ وضاحت کر دی گئی کہ جنت میں جو شراب عطا ہوگی یہ ایسا مشروب ہوگا جس کے پینے سے خیالات پر وہ اثر ہوگا جو سونٹھ کے استعمال سے معدے کے مریض پر ہوتا ہے۔ یعنی شراب کے یہ پیالے فاسد خیالات اور فاسد جذبات کا قلع قمع کر دیں گے۔ گویا یہ سب روحانی مقامات ہیں جن پر بتدریج اہل جنت کو فائز کیا جائے گا، ان مقامات کو کارلائل نہ سمجھ سکا اور انہیں حقیقت پر محمول کر بیٹھا۔

جنت کی دوشیزائیں

اہل جنت کو جو دوشیزائیں عطا کی جائیں گی ان کے بارے میں بعض مفسرین نے (سب نے نہیں) بڑے رومانی نقشے کھینچے ہیں اور مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ کارلائل شاید ان تفسیری کہانیوں کو پڑھ کر بھی یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ "اسلام میں جنت کا حیوانی تصور پیش کیا گیا ہے جس سے انسان کے روحانی احساسات بری طرح مجروح ہوتے ہیں۔" حالانکہ بات کچھ اور تھی جس کی طرف بہت کم لوگوں کی نگاہ جا سکی۔ اگر قرآن شریف کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں بھی جنت کی عورتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے کسی جگہ بھی کسی جنسی یا شہوانی امر کا شائبہ تک نہیں بلکہ جنت میں داخل ہونے والی عورتوں کے مراتب بیان کئے جا رہے ہیں اور انہیں مردوں کے ہم رتبہ قرار دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ
الخ ○ (الحدید۔ ۱۲)

"یعنی جس دن تم دیکھو گے کہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کا نور ان کے سامنے کی طرف سے بھی اور دائیں اور بائیں اطراف میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوگا اور (ان

مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت میں جو شراب عطا ہوگی وہ نہایت پاکیزہ ہوگی جسے پی کر نشہ نہیں ہو گا اور نہ انسان لغویات بکے گا نہ کسی اور گناہ کا ارتکاب کرے گا پس ثابت ہوا کہ وہ شراب ہماری دنیا کی طرح مادی شراب نہیں ہوگی بلکہ وہ کوئی اور ہی چیز ہوگی، کوئی اور ہی نعمت ہوگی جس کی حقیقت ہم نہیں جانتے بلکہ جان سکتے ہی نہیں کیونکہ ہمارے مادی حواس ان غیرمادی اور روحانی چیزوں کا ادراک نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس شراب کے بارے میں ہمیں گومگو کی حالت میں نہیں چھوڑا بلکہ نہایت بلیغ اشارے کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِن کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُھَا
کَافُوْرًا ○ (الدھر۔۵)

”یعنی جنت میں للہ کے نیک بندوں کو ایسے پیالے پلائے
جائیں گے جن میں کافور کی خاصیت ہوگی۔“

گویا یہ شراب مدہوش کر دینے والی نہیں ہوگی بلکہ اس کے پینے سے انسان کے خیالات میں تغیر عظیم پیدا ہو جائے گا اور جس طرح کافور جسم کی رطوبتوں کو ختم کر دیتا ہے، غیر ضروری جوش کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور جرثوموں کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح ان پیالوں کے پینے سے انسان کے تمام برے خیالات کافور ہو جائیں گے اور وہ جنت میں رہنے کے قابل ہو جائے گا۔ پھر فرمایا:

وَیُسْقَوْنَ فِیْھَا کَاْسًا کَانَ مِزَاجُھَا زَنْجَبِیْلًا ○
(الدھر۔۱۷)

”یعنی جنتیوں کو ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں ادرک
(سونٹھ) کی آمیزش ہوگی۔“

یہاں پھر اس امر کی نفی کر دی گئی کہ جنت میں جو شراب دی جائے گی وہ کوئی

نشہ آور چیز ہوگی بلکہ وضاحت کر دی گئی کہ جنت میں جو شراب عطا ہوگی یہ ایسا مشروب ہو گا جس کے پینے سے خیالات پر وہ اثر ہو گا جو سونٹھ کے استعمال سے معدے کے مریض پر ہوتا ہے۔ یعنی شراب کے یہ پیالے فاسد خیالات اور فاسد جذبات کا قلع قمع کر دیں گے۔ گویا یہ سب روحانی مقامات ہیں جن پر بتدریج اہل جنت کو فائز کیا جائے گا، ان مقامات کو کارلائل نہ سمجھ سکا اور انہیں حقیقت پر محمول کر بیٹھا۔

جنت کی دوشیزائیں

اہل جنت کو جو دوشیزائیں عطا کی جائیں گی ان کے بارے میں بعض مفسرین نے (سب نے نہیں) بڑے رومانی نقشے کھینچے ہیں اور مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ کارلائل شاید ان تفسیری کہانیوں کو پڑھ کر بھی یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ ”اسلام میں جنت کا حیوانی تصور پیش کیا گیا ہے جس سے انسان کے روحانی احساسات بری طرح مجروح ہوتے ہیں۔“ حالانکہ بات کچھ اور تھی جس کی طرف بہت کم لوگوں کی نگاہ جا سکی۔ اگر قرآن شریف کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں بھی جنت کی عورتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے کسی جگہ بھی کسی جنسی یا شہوانی امر کا شائبہ تک نہیں بلکہ جنت میں داخل ہونے والی عورتوں کے مراتب بیان کئے جا رہے ہیں اور انہیں مردوں کے ہم رتبہ قرار دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُھُمْ
○ (الحدید۔۱۲)

”یعنی جس دن تم دیکھو گے کہ مومن مردوں اور مومن
عورتوں کا نور ان کے سامنے کی طرف سے بھی اور دائیں اور
بائیں اطراف میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو گا اور (ان

> سے کہا جائے گا کہ) آج تمہیں ایسے باغوں میں داخل ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے جن میں نہریں جاری ہیں۔"

یہ وہ عورتیں ہوں گی جنہوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی گزاری، جان دے دی مگر اپنی عفت و عصمت پر آنچ نہ آنے دی۔ تکلیفیں جھیلیں، دکھ اٹھائے، ظلم سہے، ان کے جسم اور چہرے داغے گئے، بعض کو ان کی کم صورتی پر طعنے دیئے گئے اور نشانہ ء ستم بنایا گیا مگر انہوں نے اپنے اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر یہ سارے دکھ برداشت کئے مگر اپنے پایہ ء ثبات میں لغزش نہیں آنے دی۔ ایسی صابرو شاکر اور پاکباز عورتوں کو اللہ تعالیٰ جنت میں مقامات بلند پر فائز فرمائے گا، چنانچہ فرمایا:

> "یہ عورتیں نوجوان ہوں گی۔" (سورہ رحمان۔ ۳۳)
>
> "بڑی بڑی آنکھوں والی حسین و جمیل اور حیادار ہوں گی۔" (سورۃ صافات۔ ۴۸، ۴۹)
>
> "جنہیں اس سے قبل نہ انسانوں (۱) نے چھوا ہو گا نہ جنوں نے۔" (سورۃ رحمان۔ ۵۶)

اس آخری آیت نے تو قطعی فیصلہ کر دیا کہ یہاں جنت میں داخل ہونے والی عورتوں کے مراتب بیان کئے جا رہے ہیں کہ جنت میں وہی عورتیں داخل ہوں گی جنہوں نے اپنے آپ کو غیر مردوں سے محفوظ رکھا ہو گا۔ جو پاکباز ہوں گی، عفت مآب ہوں گی، جنہوں نے دنیا میں اپنی نگاہیں نیچی رکھی ہوں گی۔ فرمایا کہ انہیں ہم جنت میں دائمی جوانی عطا کریں گے حسن و جمال کی دولت سے نوازیں گے وہ اپنے نیک

---

(۱) انسانوں سے مراد غیر مرد ہیں۔ (مولف)

فطرت شوہروں کے ساتھ پاکیزہ زندگی گزاریں گی۔ دنیا کی ساری تکلیفیں ان سے دور کر دی جائیں گی۔ ایک نور دائمی طور پر ان کے ساتھ ساتھ رہے گا گویا وہ نورانی وجود بن جائیں گی۔ ہمیں بتایا جائے کہ اس میں کون سی بات حیوانی ہے؟

جنت کی نعمتوں کی حقیقت

ایک آخری بات کہہ کر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ جنت کی جن نعمتوں کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے انہیں ظاہر پر محمول کرنے سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس حقیقت پر غور نہیں کیا گیا کہ "جنت" کے معروف معنی کے علاوہ اس کے ایک معنی چھپی ہوئی چیز کے بھی ہیں۔ چونکہ جنت اور اس میں عطا کی جانے والی نعمتیں ابھی ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اس لئے انہیں "جنت" کے لفظ سے موسوم کیا گیا مگر ہم نے اس کی تفصیلات میں دفتر سیاہ کر ڈالے حالانکہ خود خداوند تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرما دیا تھا کہ:

> فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ (سورۃ السجدہ۔ ۱۷)
>
> "یعنی کسی شخص کو نہیں معلوم، کوئی نہیں جانتا، کسی کے علم میں نہیں کہ ان لوگوں (مومنوں) کے لئے آنکھیں ٹھنڈی کرنے والی کیسی کیسی چیزیں جنت میں جزا کے طور پر پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرما دیا کہ تم اپنی عقل کے گھوڑے نہ دوڑاؤ اور قیاسات سے کام مت لو، مومن مردوں اور مومن عورتوں کو جزا کے طور پر جنت میں جو انعامات عطا کئے جائیں گے ان کے بارے میں تم میں سے کوئی کچھ نہیں جانتا۔ یعنی یہ ایسی نعمتیں ہیں جو بیان میں آ سکتی ہی نہیں اور ان کی لذات و

کیفیات کا ادراک اس دنیا میں کیا جا سکتا ہی نہیں۔ پھر ارشاد ہوا:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۔ (سورۃ الرعد۔ ۳۵)

"یعنی (یہ) مثالی بیان ہے اس جنت کا جس کے عطا کئے جانے کا
مومنوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔"

گویا قرآن کریم کا مدعا یہ ہے کہ جنت کے باغ، جنت کی نہریں، جنت کے پھل، جنت کا دودھ اور شہد اس دنیا کے باغوں، نہروں، پھلوں اور دودھ یا شہد کی طرح نہیں ہوں گے۔ اے لوگو! تمہیں سمجھانے کے لئے مثال کے طور پر ان دنیاوی اشیا کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ جنت میں عطا کی جانے والی ان نعمتوں کی کیفیت تو کچھ اور ہی ہوگی جن کا تمہیں اندازہ ہی نہیں۔

اس لطیف اور روحانی نکتے تک حضورؐ اقدس کے شاگرد خاص اور عظیم مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ذہن رسا پہنچ گیا اور آپؓ کے قلب روشن پر اصل حقیقت منکشف ہو گئی چنانچہ آپؓ نے فرمایا:

"جنت کی نعمتوں اور دنیاوی اشیا میں صرف نام کی مشابہت ہے
ورنہ یہاں کی چیزوں کو جنت کی نعمتوں سے کیا نسبت۔" (۲)

حقیقی جنت

یہاں ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ کارلائل کی نگاہِ باریک بیں اس نکتے تک پہنچ گئی کہ قرآن کی اصل جنت دیدار الٰہی ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل جنت تو کچھ اور ہی ہے جس کے حصول کے شوق میں حضورؐ اقدس کے صحابہؓ اور ہمارے اکابر سابقین نے اپنی جانیں قربان کر دیں، مر مٹے

---

(۲) تفسیر ابن کثیرؒ زیر آیت نمبر ۲۵ سورہ بقر۔ (جلد اول)

اس جنت کے حصول کی خاطر۔ وہ جنت ہے رضائے الٰہی کا حصول اور دیدار الٰہی۔ قرآن حکیم اس حقیقی جنت کی طرف کیسے خوبصورت انداز سے اشارے کرتا ہے اور اہل ایمان کو بتدریج اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں پہنچ کر سارے پردے اٹھ جاتے ہیں اور عاشق اپنے محبوب حقیقی کے دیدار جمال سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر کے اصل گوہر مقصود کو پا لیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (سورۃ الصافات۔ ۴۴)

"(اہل جنت) ایک دوسرے کے سامنے چھپر کھٹوں پر بیٹھے
ہوں گے۔"

جب تک دو آدمیوں میں ناچاقی موجود رہے، رنجش ہو، کینہ ہو اس وقت تک وہ ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اہل جنت کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے چھپر کھٹوں پر بیٹھے ہوں گے۔ "چھپر کھٹ" ان کے مقام بلند کی علامت ہے۔ گویا ان کے دل بغض و حسد اور نفاق و عداوت سے پاک کر دیئے جائیں گے اور دنیاوی آلائشیں ان کے سینوں سے نکال پھینکی جائیں گی۔ ان میں سے ہر ایک، دوسرے کا سچا رفیق اور یار جانی ہو گا، وہ ایک دوسرے کو دعا اور سلام کے تحفے دیں گے۔ ہر وقت ذکر الٰہی ان کا شغل ہو گا۔" (یٰسٓ۔ ۵۵) جب وہ اس مقام پر فائز ہو جائیں گے تو پھر اس سے آگے ایک اور مقام آئے گا اور:

وَالْمَلٰٓئِکَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ
عَلَیْکُمْ ۔ (سورۃ الرعد۔ ۲۳، ۲۴)

(فرشتے ہر دروازے سے اہل جنت کے پاس آئیں گے اور
ان پر سلام بھیجیں گے) پھر خوش نصیبی کی انتہا ہو جائے گی کہ:

"خود رب کریم ان پر سلام بھیجے گا۔" (یٰسٓ۔ ۵۸)

اس کے بعد ایک تیسرا اور آخری مقام آئے گا جس کے بارے میں فرمایا کہ:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ہ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○ (القیامت۔ ۲۲، ۲۳)

"اور اس دن (اہل جنت کے) چہرے بہت بارونق و مسرور ہوں گے اور ان کی نظریں دیدار الٰہی سے شاد کام ہوں گی۔" (گویا وہ اپنے گوہر مقصود کو پالیں گے۔)

یہ ہے حقیقی جنت جس کا قرآن تصور پیش کرتا ہے۔ جس کی رو سے وہی لوگ (مرد و عورت دونوں) جنت کے سزاوار ہوں گے جن کے سینے ایک دوسرے کے خلاف بغض و کدورت سے صاف ہوں گے۔ جو دوسروں کو دکھ اور آزار نہیں پہنچائیں گے، فتنہ و فساد سے دامن کشاں رہیں گے، بنی نوع انسان کے بہی خواہ اور خیر طلب ہوں گے، دوسروں کو معاف کر دیا کریں گے، اپنی نگاہیں نیچی رکھیں گے، بے حیائی، عریانی، فحاشی، بدکاری اور بدکرداری سے دامن کو پاک رکھیں گے اور جن کا ہر قدم رضائے الٰہی کے مطابق اٹھے گا۔ سلام بھیجے گا ان پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے انہیں اس جنت میں وہ تمام نعمتیں عطا کی جائیں گی جن کی انہیں خواہش ہو گی بلکہ ان کی خواہش سے بڑھ کر انہیں عطا کیا جائے گا اور ایسی ایسی نعمتیں دی جائیں گی جو ان کے وہم و گمان میں نہیں آسکتیں۔

رسولِ کریمؐ کی جنگیں

"(حضرت) محمدؐ کے ابنائے وطن نے جب آپؐ کو نہایت بے رحمی کے ساتھ آپؐ کے وطن سے نکال دیا، نہ صرف آپؐ کا پیغام ربانی سننے سے انکار کر دیا بلکہ آپؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے تو مادر صحرا کا یہ فرزندؐ جوش میں آگیا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ اپنی مدافعت کرے گا اور اس طرح کرے گا جس طرح ایک باحمیت انسان اور ایک غیرت دار عرب کیا کرتا ہے۔ گویا وہ کہہ رہا ہو کہ اگر قریش یہی چاہتے ہیں تو چلو یہی سہی۔ اگر یہ اس پیغام ربانی کو سننے سے گریزاں ہیں جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ ساری بنی نوع انسان کے لئے خیر و فلاح کا پیغام ہے اور اس پیغام کو جبر و ظلم اور تلوار کے ذریعے دبانا چاہتے ہیں تو یہ اپنا شوق تیغ زنی بھی پورا کر لیں" (اب ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں) (کارلائل)

کارلائل کے یہ الفاظ جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جنگوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھے ہیں اگرچہ بظاہر نہایت اثر انگیز ہیں اور کارلائل کی طرف سے یہ حضورؐ اقدس کو بہت بھرپور، خوبصورت اور دلکش خراج تحسین ہے لیکن اس کے باوجود بات وہ نہیں جو کارلائل نے سمجھی ہے۔ اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ رسولؐ اقدس غیرت و حمیت کے پیکرِ عظیم تھے، آپؐ سے بڑا غیرت دار روئے زمین پر آج تک پیدا نہیں ہوا اور نہ قیامت تک پیدا ہو گا لیکن دشمنانِ

اسلام کے ساتھ آپؐ کی جنگوں کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ یہ معرکہ آرائی آپؐ کے ذاتی انتقام، اظہارِ غیرت و شجاعت یا شخصی جوش و جذبہ کا نتیجہ تھی، نہایت غلط خیال ہے۔ اگر اس خیال کو درست مان لیا جائے تو اس سے یہ ثابت ہو گا کہ مخالفینِ اسلام کی طرف سے جبر و تشدد دیکھ کر آپؐ کا جذبہ انتقام جوش میں آگیا اور آپؐ دشمنانِ اسلام کے خلاف میدان میں آگئے گویا یہ ساری جنگ و پیکار اور مسلح جدوجہد آپؐ کی ذاتی انا کی تسکین کے لئے تھی۔ یہ طرز فکر نہ صرف حضورؐ اقدس کے مزاجِ مبارک کے خلاف ہے بلکہ واقعات اس کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔

رسولِؐ اقدس کا عفو و درگذر

تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ کون سا ظلم تھا جو اہل مکہ نے آپؐ پر روا نہیں رکھا، طائف میں آپؐ پر کیسے کیسے ستم توڑے گئے، آپؐ سے دشمنوں کے لئے بددعا کرنے کو کہا گیا مگر آپؐ نے ان کے لئے دعا کی، اپنے دستِ اقدس سے کسی بدترین دشمن کو جوابی طور پر بھی ایذا نہیں دی۔ حضورؐ اقدس جسمانی طور پر غیر معمولی طاقتور اور توانا تھے۔ جب ابو جہل نے آپؐ کے رخسار مبارک پر طمانچہ مارا تو اس کے جواب میں آپؐ اس کے گال پر ایسا تھپڑ رسید کر سکتے تھے کہ اس کا منہ گھوم جاتا مگر آپؐ نے غیر معمولی صبر سے کام لیا، انتقام نہیں لیا بلکہ تاریخ کہتی ہے کہ آپؐ کے چچا سید الشہدا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب نے جب آپؐ کی شان میں ابو جہل کی طرف سے گستاخی کی خبر سنی تو اسی وقت اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور خانہ کعبہ میں اسے جا لیا اور اس کے سر پر اپنی وزنی کمان دے ماری۔ اسے لہولہان کر کے حضورؐ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "اے

میرے بھتیجے! خوش ہو جاؤ کہ میں نے ابو جہل سے تمہارا انتقام لے لیا۔" تاریخ کی شہادت ہے کہ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا کہ

> "اے میرے چچا! میں انتقام لینے سے خوش نہیں ہوا کرتا۔ میں تو
> اس وقت خوش ہوں گا جب آپ اسلام قبول کر لیں گے" (۲)

اور دوسرے لمحے حضرت حمزہؓ کی زبان پر کلمہ شہادت جاری تھا۔

گویا آپؐ کے سامنے اپنی ذات یا قبیلہ کا سوال نہ تھا، مخالفوں اور دشمنوں سے انتقام لینا مقصود نہ تھا بلکہ مقصد اول و آخر صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی تھی، دین کی سربلندی تھی۔

دشمنوں کے لئے دعا

ذرا تصور تو کیجئے کہ احد کا میدان ہے، دشمن کا لشکر رسولؐ اقدس اور آپؐ کے نام لیواؤں کے نام تک بزعم خود مٹا دینے کے در پے ہے، تیروں کی بارش ہو رہی ہے، حضورؐ اقدس زخمی ہو جاتے ہیں، دندانِ مبارک شہید ہو جاتے ہیں، دہنِ مبارک سے خون بہہ رہا ہے مگر چہرہ انور پر دور دور تک غیظ و غضب کے آثار نہیں، لبوں پر نعرہ انتقام نہیں، ہاں! زبان مبارک پر کچھ الفاظ ضرور جاری ہیں مگر۔۔۔! آپ کو معلوم ہے وہ الفاظ کیا ہیں؟ سنئے:

الھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (۳)

---

(۱) ایک روایت ہے کہ ابو جہل نے حضور اکرمؐ کے سرِ اقدس پر پتھر مارا تھا۔ (پیام)

(۲) "رحمتہ للعالمین" جلد اول ص ۷۶ مصنفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری ۱۹۴۴۔ (مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

(۳) "شفا" ص ۱۴۱۔ مولفہ حضرت قاضی ابوالفضل عیاض بن موسیٰ۔ مطبع الشرکت الصحافیہ فی البلد العثمانیہ مطبوعہ ۱۳۲۷ھ (حیدر آباد دکن)

(اے اللہ میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ یہ لوگ جانتے
نہیں (کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کس کے ساتھ کر رہے ہیں)

گویا اپنے خونخوار دشمنوں کا بھی دکھ میں پڑنا آپؐ کو طبعاً گراں گزرتا تھا، ایذا دہی کو آپ سخت ناپسند فرماتے تھے، آپؐ کے مزاج کا جھکاؤ عفو و درگزر کی طرف تھا ذیل کے تاریخ ساز واقعے سے حضورؐ اقدس کے طرزِ فکر اور افتادِ طبع کا ایک عجیب دل کش و دل نشیں پہلو سامنے آتا ہے۔

حضورؐ اقدس کا جنگ سے انکار

جو لوگ حضورؐ اقدس پر ایمان لائے تھے وہ بھی آخر عرب تھے، قریش تھے، غیرت و حمیت کے پیکر اور شجاعت و صلابت کے متحرک مجسّمے، دشمنوں کے مظالم پر مسلسل خاموشی ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ آخر ان میں سے چند لوگ مکہ کے ایک نامور سردار حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی معیت میں حضورؐ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ

> "اے اللہ کے رسولؐ! جب ہم مشرک تھے تو عزت والے تھے اور کسی کی جرات نہ تھی کہ ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکے لیکن مسلمان ہو کر ہم ضعیف و ناتواں ہو گئے ہیں اور دشمن کے ہاتھوں ذلیل ہو رہے ہیں، اس کے ظلم و ستم برداشت کر رہے ہیں۔ اے اللہ کے رسولؐ! اجازت دیجئے کہ میدان میں اتر کر ہم ان کا مقابلہ کریں۔"

آپ کو معلوم ہے کہ غیرت و حمیت کے ان پیکروں کو ---- ہاں! اللہ اور اس کے رسولؐ کے ان فدائیوں کو ---- حضورؐ اقدس نے کیا جواب دیا؟ آپ نے فرمایا:

انی امرت بالعفو فلا تقاتلوا (۴)

(مجھے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم ہے اس لئے میں تمہیں (دشمن سے) جنگ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا)

حضورؐ اقدس کے یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ آپؐ کا ہر قدم اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق اٹھتا تھا، آپؐ کی زندگی کا ہر لمحہ، آپؐ کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، دوستی، دشمنی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؐ کے سربکف اور جاں باز عقیدتمند آپؐ سے جنگ کی اجازت مانگتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کے معزز لوگ ہیں، ماضی میں کوئی ہماری طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد ہماری عزت اور شجاعت میں کوئی کمی نہیں ہوئی، ہماری ہمتیں پست نہیں ہوئیں، ہم وہی سربکف اور سرباز لوگ ہیں۔ اے اللہ کے مقدس رسولؐ! آپؐ ہمیں اجازت دیں تاکہ ہم ان دشمنانِ اسلام کے سروں میں سے فرعونیت کا سودا نکال دیں ---- مگر اپنے سرفروش عقیدتمندوں کو آمادہ جنگ پا کر بھی آپؐ انہیں اجازت جنگ نہیں دیتے حالانکہ آپؐ خود دشمنوں کے ہاتھوں سخت اذیت ناک زندگی گزار رہے تھے لیکن اس کے باوجود آپؐ جوش میں نہیں آتے اور فرماتے ہیں کہ "ہرگز نہیں، مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ عفو و درگزر کا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے پھر میں تمہیں جنگ کی اجازت کیسے دوں؟

قرآن کریم کی شہادت

خود قرآن کریم بھی اس حدیث مبارک کی تائید کرتا ہے جس کی رو سے

---

(۴) "السنن الکبریٰ" مولفہ امام بیہقیؒ۔ جلد نمبر ۹، ص ۱۷۔ مطبوعہ بیروت طبع جدید ۱۹۹۴ء

بعض جوشیلے اور جنگ جو مسلمان دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہونے کے لئے بیتاب تھے اور مدینہ جا کر ان کا جذبہ جہاد اور بھی مشتعل ہو گیا تھا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ الخ (النساء۔۷۷)

”(اے رسول) کیا آپ کو ان لوگوں کے بارے میں معلوم نہیں جنہیں کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو جنگ سے روکے رکھو۔“

یعنی مسلمانوں کے دلوں میں دینی غیرت کی وجہ سے دشمنان اسلام سے جنگ کرنے کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ اقدس کے ذریعے سے انہیں روک دیا تھا کہ ابھی جنگ کا وقت نہیں آیا اس لئے صبر سے کام لو اور انتظار کرو۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ الخ (سورہ محمد۔۲۰)

”(جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ (رسول کریمؐ پر) کوئی ایسی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی جس میں جنگ کا حکم دیا گیا ہو۔)“

گویا یہاں بھی بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان بزدل نہیں تھے، جنگ سے خائف نہیں تھے بلکہ ان کے دلوں میں کفار سے جنگ آزما ہونے کا جذبہ جوش زن رہتا تھا اور بار بار تڑپ پیدا ہوتی تھی کہ کاش انہیں دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہونے کی اجازت مل جائے مگر اس کے باوجود حضورؐ اقدس انہیں جنگ سے روک رہے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو روک دیا تھا، پس ثابت ہو گیا کہ دشمنوں سے جنگ کرنے میں آپؐ کے اپنے ارادے کو دخل نہ تھا، ذاتی پسند و ناپسند یا شخصی انا درمیان میں نہ تھی، مخالفین سے انتقام لینے کا ذاتی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔

جنگ کا حکم

پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب اچانک آپؐ کا طرز فکر و عمل بدل جاتا ہے

اور عفو و درگذر کا یہ پیکر عظیم ہمیں میدان جنگ میں اسلامی لشکر کی قیادت کرتا نظر آتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ قرآن شریف اس کا جواب دیتا ہے، فرمایا:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط (الحج ۳۹)

”(اب) ان لوگوں (مسلمانوں) کو (بھی) جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جن سے (کفار) جنگ کر رہے ہیں کیونکہ ان (مسلمانوں) پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے)“

اس ارشاد خداوندی کے بعد تسبیح بدست لوگ جو ریشم سے بھی زیادہ نرم دکھائی دیتے تھے شمشیر بدست ہو کر اپنے آقاؐ و مولا کی قیادت میں برسر میدان آ گئے۔ گویا حضورؐ اقدس نے اس وقت تک جنگ سے ہاتھ روکے رکھا جب تک اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی لیکن جب اذنِ الٰہی ہو گیا کہ اے میرے رسولؐ اب آپؐ کو بھی اجازت دی جاتی ہے کہ ان لوگوں سے لڑیئے جو آپؐ سے لڑتے ہیں کیونکہ ان کا ظلم اب حد سے تجاوز کر گیا ہے ---- تب آپؐ نے تلوار اٹھائی۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ
حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ الخ (البقرہ۔۱۹۱)

(انہیں جہاں پاؤ قتل کرو اور تم بھی انہیں وہاں سے نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے)

اس کے بعد فرمایا کہ یہ عمل اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ شرارت اور فتنہ ختم نہ ہو جائے کیونکہ فتنہ قتل سے بھی زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتا ہے۔

فتنہ ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑ کو ختم کر دیا جائے اور اس فتنہ کی جڑ مکہ میں تھی، فتنہ پرداز لوگ وہیں بیٹھے حضورؐ اقدس کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیاں کر رہے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم انہیں وہاں سے نکال دو

جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب مکہ پر حملہ کیا جائے۔ گویا اس آیت میں مکہ کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم بھی دیا جارہا ہے اور فتح مکہ کی خوشخبری بھی دی جارہی ہے۔ اس طرح قرآن کریم دنیا کو بتارہا ہے کہ کفار سے جنگ و پیکار محمد رسول اللہؐ کا ذاتی فیصلہ نہیں تھا، یہ آپؐ کا کوئی انتقامی اقدام نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ترین حکم تھا جس کے پیچھے ایک فلسفہ کام کررہا تھا۔ اس کی وضاحت ذیل کی آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الخ (البقرہ۔ ۱۹۰)

یعنی تم جنگ ضرور کرو، جو لوگ تم سے لڑتے ہیں ان سے ضرور لڑو لیکن یہ جنگ ذاتی انتقام کی خاطر نہ ہو، ذاتی مفاد کی خاطر نہ ہو، انتقامی جوش کے تحت نہ ہو بلکہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر ہو، اسے راضی کرنے کی خاطر ہو اسی لئے فرمایا:

"فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ"

اللہ کے راستے میں، یعنی اللہ کے لئے ------ ذاتی انتقام یا ذاتی مفاد کے لئے نہیں۔ اس طرح اسلام نے جنگ کو بھی عبادت کا درجہ دے دیا جس میں نفس کا دخل باقی نہیں رہا۔

اسلام کا اصول جنگ

تاریخ بتاتی ہے کہ جب میدان جنگ گرم ہوتا ہے اور جنگ اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے تو فاتح فوجیں، مفتوحین پر بھوکے شیروں کی طرح ٹوٹ پڑتی ہیں۔ ان کے اموال، ان کی جانیں حتیٰ کہ ان کی عزتیں تک تاراج کردیتی ہیں۔ آگ اور خون کا ایک طوفان ہوتا ہے جو تباہیاں، بربادیاں اور ہلاکت آفرینیاں اپنی جلو میں لئے قیامت کی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہوتا ہے اور ہر خشک و تر کو جلاتا اور راکھ کا ڈھیر

بناتا چلا جاتا ہے اور اپنے پیچھے ویرانیوں کے سوائے اور کچھ نہیں چھوڑتا۔ مگر حضورؐ اقدس کو ایسی انسانیت سوز جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس کی اجازت نہیں دی گئی، جوش انتقام سے بے قابو ہونے سے سختی سے روک دیا گیا چنانچہ ارشاد ہوا۔

وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○ (البقرہ۔ ۱۹۰)

"(یعنی جو لوگ تم سے جنگ کررہے ہیں اب تم بھی ان سے جنگ کرو مگر زیادتی مت کرو (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے اور حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

پھر فرمایا:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا

الخ (المائدہ۔ ۸)

مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو! کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس حد تک نہ لے جائے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو، انصاف کرو کہ یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

گویا اسلام جنگ کی بنیاد بھی تقویٰ اور خوف خدا پر رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو لڑائی خوف خدا کے تحت لڑی جائے گی اس کے نتائج کس قدر خوش کن ہوں گے اور اس میں کس قدر احتیاط کی جائے گی۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی
یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْہِ فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ (البقرہ۔ ۱۹۱)

یعنی تم ان (دشمنوں) سے مسجد حرام کے قرب و جوار میں جنگ مت کرو جب تک وہ خود تم سے جنگ نہ کریں ہاں اگر وہ خود تم سے لڑائی چھیڑ دیں تو تم بھی ان سے لڑو۔

پھر فرمایا کہ:

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ۔ ۱۹۳)

”یعنی اگر دشمن جنگ سے باز آجائے تو تم بھی ہاتھ روک لو کیونکہ سختی اور تشدد سوائے ظالموں کے اور کسی کے لئے روا نہیں۔“

ان آیات کریمہ میں حضورؐ اقدس کو اور آپؐ کی معرفت مسلمانوں کو جنگ کے اصول تعلیم فرمائے جا رہے ہیں جن کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱) تم خود جنگ کی ابتدامت کرو اور لوگوں کے ساتھ امن و آشتی کے ساتھ زندگی گزارو۔

(۲) جب دشمن تم پر حملہ آور ہو تو بزدلی مت دکھاؤ اور پوری قوت و شدت سے جنگ کرو۔

(۳) جنگ کرتے ہوئے اعتدال کا راستہ اختیار کرو اور ظلم و زیادتی سے کام نہ لو۔

(۴) اگر دشمن ہاتھ روک لے تو تم بھی ہاتھ روک لو اور محض فتوحات حاصل کرنے کے شوق یا مال غنیمت کے لالچ میں خوں ریزی جاری مت رکھو۔

(۵) تمہاری جنگ ذاتی انتقام کی خاطر نہ ہو بلکہ مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضاجوئی ہونا چاہئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں اور حد سے گزر جانے والوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔

گویا قرآن دنیا کو بتا رہا ہے کہ اسلام جنگ اور امن، محبت اور عداوت دونوں کو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کر دیتا ہے۔ اس نے جنگ کا ایک باقاعدہ فلسفہ پیش کیا جس کی بنیاد خواہشِ امن پر ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ نظریہ قطعی طور پر باطل ہو جاتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ نے محض جوشِ انتقام اور اظہارِ شجاعت و غیرت کی خاطر تلوار کو بے نیام کیا۔ حقائق

ثابت کر رہے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں تھا بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہونے کا حکم دیا جس کی قرآن کریم شہادت دے رہا ہے اور قرآن کے بارے میں خود کارلائل اعتراف کرتے ہیں کہ:

> یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ وہ (حضرت محمدؐ) اپنے ذاتی مفاد کی خاطر فریب کاری کرتے تھے یا خود ہی وحی و الہام گھڑ کر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے تھے ـــــ نہیں ہرگز نہیں یہ سراسر غلط ہے۔ (۵)

آگے چل کر کارلائل تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن صداقت و راستی کا مجموعہ ہے یہ کوئی جعلی اور خود ساختہ صحیفہ نہیں ـــــ پس اس آسمانی صحیفے نے تصدیق فرمادی کہ رسولؐ کریم نے اس وقت تک تلوار نہیں اٹھائی جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہوا۔

---

(5) Heroes and Hero Worship, P-301 (Dent:London)

مقامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کچھ مدت قبل ہفت روزہ "تقاضے" لاہور میں اس گنہگار کا ایک مضمون "مقامِ محمدؐ" کے زیرِ عنوان شائع ہوا تھا۔ اب یہ مضمون بہت سے مفید اضافوں کے ساتھ زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے کہ یہ اس کا سب سے بہتر مقام ہے۔ (پیام)

دنیا میں جتنے بھی نبی و رسول مبعوث ہوئے اسلام ان سب پر ایمان لانے اور ان سب کا یکساں ادب و احترام کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ سب خدا کے فرستادے تھے لیکن ان رسولوں اور نبیوں میں ایک ایسا جلیل القدر نبی و رسول بھی مبعوث ہوا جو اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے سارے رسولوں اور سارے نبیوں پر فضیلت رکھتا ہے۔ یہ رسول و نبی ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

انبیائے سابقین مقامی نبی تھے

آپ ﷺ سے پہلے جتنے بھی نبی و رسول مبعوث ہوئے وہ سب اپنی اپنی قوموں کی طرف بھیجے گئے اور خود ان میں سے ہر رسول نے یہی کہا کہ "اے میری قوم! میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں" (دوسری قوموں کی طرف نہیں) چنانچہ آدمِ ثانی حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"نوح کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا"

(سورہ ھود۔ آیت نمبر ۲۵)

حضرت ہودؑ کے بارے میں فرمایا:

"ھود کو (ہم نے) ان کے بھائیوں عاد کی طرف رسول بنا کر بھیجا" (سورہ ھود۔ آیت نمبر ۵۰)

حضرت صالحؑ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ:

"اور صالح کو (ہم نے) ان کے بھائیوں ثمود کی طرف رسول بنا کر بھیجا" (سورہ ھود۔ آیت ۶۱)

حضرت شعیبؑ کے بارے میں فرمایا کہ:

"اور ہم نے شعیب کو ان کے بھائیوں (یعنی ان کی قوم) کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور انہوں نے کہا اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی پرستش کرو" (سورہ ھود۔ آیت نمبر ۸۴)

اور بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

"اور اللہ تعالیٰ عیسیٰ (ابن مریم کو) بنی اسرائیل کی طرف (اپنا) رسول بنا کر بھیجے گا۔ (یعنی دوسری قوموں کی طرف نہیں)"

(آل عمران۔ آیت نمبر ۴۹)

آنحضورؐ سارے بنی نوع انسان کے لئے مبعوث ہوئے

گویا جنابِ نوحؑ بلکہ جنابِ آدمؑ سے لے کر جنابِ مسیحؑ ابن مریم تک سارے نبی اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے اور انہی کے منجی تھے دنیا کی باقی اقوام کی نجات سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن آنخضرت ﷺ دنیا کے واحد رسول و نبی ہیں جو ساری انسانیت اور تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث فرمائے گئے

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

(سورہ الاعراف۔ آیت نمبر ۱۵۸)

(اے میرے رسول! کہہ دیجئے کہ "اے لوگو! میں تمام بنی نوع انسان کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں") یعنی صرف اہل مکہ، صرف اہل مدینہ یا صرف اہل عرب آپؐ کے مخاطب نہیں ہیں بلکہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان آنحضورؐ کے مخاطب ہیں اور جب تک دنیا میں انسان موجود رہیں گے وہ سب آپ ﷺ کے مخاطب ہوں گے کیونکہ "ناس" کے ساتھ لفظ "جمیعا" استعمال کیا گیا ہے۔ گویا اس شرف و فضیلت میں دنیا کا کوئی نبی ہمارے آقا و مولا ﷺ کا شریک نہیں۔

آنحضورؐ سارے انبیا کے جامع کمالات تھے

اور آگے چلئے فرمایا:

لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (الجن۔ آیت نمبر ۲۷)

اس آیت کا ترجمہ بیان کرنے سے پہلے اس کے سیاق و سباق کو ذہن نشین کرانا بہت ضروری ہے۔ اس آیت سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرما رہا ہے کہ آپ ان (کافروں) سے کہہ دیجئے کہ مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری تباہی کی گھڑی قریب آگئی ہے یا اس کے لئے اللہ تعالیٰ کوئی طویل مدت مقرر فرمائے گا (کیونکہ) غیب کا علم تو صرف اس کے پاس ہے اور کوئی نہیں جو اس کے غیب پر غالب آسکے سوائے ایسے رسول کے جسے وہ علم غیب سے مطلع کرنے کے لئے چن لے (یعنی رسول اقدس ﷺ کو) اور پھر اس کی (یعنی حضور اقدس ﷺ کی) حفاظت کی غرض سے اس کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتوں کے دستے مامور فرما دیتا ہے تاکہ:

لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ الخ (سورہ جن آیت۔ نمبر ۲۷)

(یعنی اسے معلوم ہو جائے، وہ دیکھ لے کہ میرے رسول نے فرشتوں کی حفاظت میں میرا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا ہے)۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ دیکھ لے کہ ---- میرے "رسول" نے میرا پیغام میرے بندوں تک پہنچا دیا ہے ---- بلکہ یہ فرمایا کہ ---- میرے "رسولوں" نے میرا پیغام پہنچا دیا ---- یہاں حضور اقدس ﷺ کے لئے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا گیا۔ یہ بہت ہی لطیف نکتہ تھا جسے سمجھنے کی کوشش بہت کم کی گئی کہ جناب رسالت مآب کے لئے "رسول" کی جگہ (رسٰلٰت) جمع کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا؟ اس میں یہ سِر اور بھید ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ جناب رسالت مآب ﷺ کو گذشتہ تمام انبیا کا جامعِ صفات قرار دے رہا ہے اور ہمیں بتا رہا ہے کہ گذشتہ انبیا میں جو کمالات فرداً" فرداً" پائے جاتے تھے وہ سب ہمارے آقا و مولا ﷺ کی ذات والا صفات میں جمع کر دیئے گئے تھے یعنی حضور اقدس ﷺ تمام انبیا کا خلاصہ اور جوہر ہیں اور آپ ﷺ کی نبوت ساری نبوتوں پر حاوی و محیط ہے اس لئے آپ ﷺ سب سے افضل ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جو آنحضور ﷺ کے علاوہ دنیا کے کسی نبی کو نہیں دیا گیا۔

آنحضورؐ کے ذریعے نو بہ نو صفات الہیہ کا ظہور

پھر فرمایا ----

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ" (سورہ فاطر۔ آیت نمبر ۱)

(یعنی ساری تعریفوں کا اللہ تعالیٰ ہی مستحق ہے جو آسمانوں اور

زمین کا خالق ہے کہ وہ (اپنے نبی پر) ایسے فرشتوں کو نازل
کرے گا جن کے دو دو، تین تین اور کبھی چار چار پر ہوں گے
اور ان کی تعداد میں جتنا چاہے گا اضافہ کردے گا۔)

فرشتوں کے پروں سے مراد صفات الٰہیہ ہیں۔ یہاں نہ صرف حضور اقدس ﷺ کو بلکہ ساری بنی نوع انسان کو بشارت دی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ پر ایسے فرشتوں کا نزول ہوگا جو اللہ کی نو بہ نو صفات کا علم لے کر اتریں گے اور آپ ﷺ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات اور کمالات سے دنیا کو آگاہ کیا جائے گا جن سے گذشتہ انبیا اور ان کی امتیں ناواقف تھیں۔ یہ ایک اور شرف اور فضیلت ہے جس میں دنیا کا کوئی نبی و رسول آپ ﷺ کا شریک نہیں۔

آنحضورؐ انبیائے سابقین کے مصدق تھے

آگے چلئے ایک اور بہت بڑا اعزاز حضور اقدس ﷺ کو عطا کیا گیا جس کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا:

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ
جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ط (سورہ النحل۔ آیت ۸۹)

(اور جس دن (روز قیامت) ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اس
امت کے مقابلے میں کھڑا کریں گے اور (اے میرے رسول
آخر میں) آپ کو ان سب (گواہوں) کے مقابلے میں گواہ بنا کر
لائیں گے۔

حضور اقدس ﷺ کو سب گواہوں کے مقابلے میں کیوں لایا جائے گا؟ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے"۔ گویا وجہ

فضیلت قرآن حکیم ہے جس میں گذشتہ تمام صحائفِ آسمانی کی ساری خوبیاں اور قابل ذکر تعلیمات محفوظ کردی گئیں۔ اس طرح قرآن حکیم نے تصدیق کردی کہ حضور اقدس ﷺ سے پہلے جو انبیا مبعوث ہوئے تھے وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے فرستادے تھے اور قرآن کریم نے شہادت دے دی کہ ان انبیائے کرام پر نازل ہونے والی کتابیں واقعی منجانب اللہ تھیں۔ پس جناب رسالت مآب ﷺ کی شہادت سے ہمیں معلوم ہوا کہ واقعی یہ انبیاء و رسل برحق تھے۔ اگر حضور ﷺ اقدس ان کی سچائی کی شہادت نہ دیتے تو ہمارے پاس ان کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی انبیائے سابقین حضور اقدس ﷺ کی شہادت کے محتاج ہوں گے جبکہ حضور اقدس ﷺ کسی نبی و رسول کی طرف سے تائید و تصدیق کے محتاج نہ ہوں گے۔ یہ وہ عظیم الشان اعزاز اور منفرد فضیلت ہے جس سے دنیا کے کسی رسول و نبی کو نہیں نوازا گیا۔

بنی اسرائیل کے لئے موعود رسولؐ

اسی مضمون کو ایک اور رنگ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ
وَّ حِكْمَةٍ اِلخ (آل عمران۔ ۸۱)

(اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب اللہ تعالیٰ نے (اہل کتاب سے) نبیوں والا عہد لیا کہ جو کتاب اور حکمت میں تمہیں دوں (اور) پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو اس (کلام) کا مصدق ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا (پھر دریافت) فرمایا (تھا) کیا تم اقرار کرتے ہو اور (ذمہ داری) قبول کرتے ہو انہوں نے کہا تھا کہ ہاں ہم نے اقرار کیا، ارشاد فرمایا تو گواہ رہنا اور میں اس پر تمہارے ساتھ گواہ ہوں تو اب جو شخص (اس عہد کے بعد) روگردانی کرے گا تو

ایسے لوگ فاسق ہوں گے)

ان آیات میں حضور اقدسؐ کی ایک بہت بڑی فضیلت بیان کی جا رہی ہے اور بنی اسرائیل کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو کتاب (تورات) عطا فرمائی تھی تو اے بنی اسرائیل! اس میں تم سے کہا گیا تھا کہ جب وہ رسول آئے جو اس کتاب کی تصدیق کر رہا ہو جو تمہیں دی گئی ہے تو اس پر ایمان لانا اور صرف ایمان ہی نہ لانا بلکہ ہر طرح اس کی مدد اور تائید و حمایت کرنا۔ تم نے اقرار بھی کر لیا تھا کہ جب بھی وہ موعود نبی آئے گا تو تم اس پر ایمان لاؤ گے۔ فرمایا اب یہ رسول آ گیا ہے اس پر ایمان لاؤ لیکن اگر تم نے اس رسول کو قبول نہ کیا تو یاد رکھو تمہارا اشمار گمراہوں اور فاسقوں میں ہو گا۔

ان دونوں آیات کے ذریعے حضورؐ اقدس کا مقامِ بلند متعین فرمایا جا رہا ہے کہ اب روئے زمین پر کسی پیغمبر کی امت محض اس پیغمبر کا نام لینے اور اس کی تصدیق کرنے سے راہ نجات نہیں پا سکتی جب تک کہ وہ حضورؐ اقدس کو قبول نہ کرے۔ گویا کیا بنی اسماعیل اور کیا بنو اسرائیل آپؐ سب کے لئے رسول ہو کر آئے تھے کیونکہ خود تورات میں حضورؐ اقدس کی شناخت کی یہ علامات بیان کی گئی ہیں:

> ”خدا سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران ہی کے
> پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا“ (۱)

---

(۱) کتاب استثنا باب ۳۳۔ آیت نمبر ۲ مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انار کلی لاہور (۱۹۲۲ء)۔ بائبل کے بہت سے ایڈیشنوں میں سے اب ”دس ہزار قدوسیوں“ کے الفاظ نکال دیئے گئے ہیں کیونکہ فتح مکہ کے وقت حضورؐ اقدس کی معیت میں دس ہزار قدسی نفس صحابہ تھے اور اس طرح ان الفاظ سے آپؐ کی صداقت ثابت ہوتی ہے جو تعصب کی وجہ سے موجودہ انجیل نویسوں کو گوارا نہیں مگر جس ایڈیشن کا ہم نے حوالہ دیا ہے یہ براہ راست عبرانی سے ترجمہ کیا گیا تھا جیسا کہ اس پر درج بھی ہے اس لئے اس میں یہ الفاظ موجود رہے۔ یہ بھی تصرفِ الٰہی ہے۔ (پیام)

یعنی خدا کا جلال تین صورتوں میں ظاہر ہو گا۔ پہلا جلال حضرت موسیٰؑ کی صورت میں جب طور سینا پر جناب موسیٰؑ کو شریعت عطا کی گئی۔ دوسرا جلال حضرت مسیح ابن مریم کی صورت میں جو ”شعیر“ مضافات فلسطین میں تشریف لائے اور خداوند کے نام کی منادی کی۔ تیسرا جلال فاران کی چوٹیوں سے ظاہر ہونا تھا اور وہ حضورؐ اقدس کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ”دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ“ ان الفاظ میں اشارہ ہے اس تاریخ ساز واقعے کی طرف جب آپؐ دس ہزار قدسی نفس صحابہ کی معیت میں فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی تصدیق

حضورؐ اقدس کو ایک یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ انبیائے سابقین آپؐ کی تشریف آوری کی بشارت دیتے چلے آ رہے ہیں ان میں سرفہرست اسم گرامی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے چنانچہ جب حضورؐ اقدس نے دعویٰ نبوت فرمایا تو یہود نے آپؐ کی سخت مخالفت کی اس پر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الخ (الاحقاف۔ ۱۰)

(یعنی آپؐ ان سے) کہئے کہ اگر یہ قرآن منجانب اللہ ہوا اور تم نے اس کا انکار کر دیا باوجودیکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ (یعنی حضرت موسیٰؑ) شہادت دے چکا ہے کہ اس کی مثل ایک شخص ظاہر ہو گا (گویا وہ تو) ایمان لے آیا مگر تم (جو اس کی امت میں سے ہو) تکبر سے کام لے رہے ہو (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ ظالموں (ناانصافی کرنے والوں) کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ قرآن شریف کے اس ارشاد کی تائید خود تورات سے ہوتی ہے چنانچہ لکھا ہے:

”میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک

نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" (۲)

یعنی اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بشارت دے رہا ہے کہ تیرے بعد ایک نبی آئے گا وہ تیرے بھائیوں (یعنی اسماعیل) میں سے ہوگا جو حضرت اسحاقؑ کے بھائی تھے۔ فرمایا کہ اس کی علامت یہ ہوگی کہ میں اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا یعنی اسے ایک کامل شریعت دوں گا اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد ایسا کوئی نبی نہیں آیا جو کامل شریعت لے کر آیا ہو۔ حضرت مسیحؑ ضرور تشریف لائے مگر وہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے بلکہ توریت ہی کے شارح تھے چنانچہ آپؑ خود فرماتے ہیں:

> "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک لحظہ یا شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے" (۳)

گویا حضرت مسیحؑ نہایت واضح الفاظ میں اقرار کر رہے ہیں کہ آپؑ حضرت موسیٰؑ کی مانند نبی نہیں تھے کیونکہ حضرت موسیٰؑ تو صاحب شریعت نبی تھے۔ دوسرے مسیحی دنیا حضرت مسیحؑ کو نبی نہیں بلکہ خدا اور خدا کا بیٹا کہتی ہے جب کہ حضرت موسیٰؑ اس نبی کی تشریف آوری کی شہادت دے رہے ہیں جو نبی ہونے کا مدعی ہوگا اور وہ حضورؐ اقدس کے سوائے اور کوئی نہیں تھا۔

---

(۲) استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸

(۳) متی کی انجیل۔ باب ۵۔ آیت ۱۷ تا ۱۸

حضرت مسیحؑ کی بشارت

جہاں تک حضرت مسیحؑ کا سوال ہے وہ تو خود حضورؐ اقدس کے مناد تھے چنانچہ قرآن شریف آپؐ کی یہ بشارت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے فرمایا:

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ (الصف۔۶)

(اور (یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا کے اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں اور مجھ سے پہلے جو توراۃ آچکی ہے اس کی تصدیق آنے والا ہوں اور ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا جن کا نام احمد ہوگا۔

یہ اعلان تو قرآن شریف کا ہے۔ قرآن شریف کے نزول سے قریباً چھ سو سال قبل انجیل مقدس میں خود حضرت مسیحؑ ان الفاظ میں اپنے بعد آنے والے اس رسولؐ معظم کا ذکر فرماتے اور جلالی شہادت دیتے ہیں:

"دنیا کا سردار آتا ہے" (۴)

یہ اعلان اس وقت کیا جا رہا ہے' یہ بشارت عین اس وقت دی جا رہی ہے جب حضرت مسیحؑ خود کو دشمنوں کے سپرد کرنے جا رہے ہیں اور چند گھڑیوں کے بعد آپؑ کو گرفتار کیا جانے والا ہے۔ آپؑ اپنے عقید تمندوں اور شاگردوں سے (بظاہر)

---

(۴) یوحنا کی انجیل باب ۱۴۔ آیت ۲۰

آخری خطاب فرما رہے ہیں اور انہیں تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> "میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا ---- اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا" (۵)

اس "مددگار" کو جناب مسیحؑ "روح حق" کے لقب سے بھی یاد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

> "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کرسکتے ○ لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا" (٦)

وہ "مددگار" اور "روح حق" کون ہے؟ اس سوال کا جواب حضرت مسیحؑ کے ان الفاظ میں موجود ہے کہ ---- "جب تک میں دنیا سے نہ جاؤں وہ نہیں آئے گا" ---- یعنی میرے بعد اس کا ظہور ہو گا ---- گویا وہ حضرت مسیحؑ کے علاوہ کوئی وجود ہے۔ اس کا مقام و مرتبہ اس طرح متعین فرماتے ہیں کہ ---- "وہ دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا" ---- یعنی وہ مجاز مطلق ہو گا۔ صاحب اختیار ہو گا، اس کے پاس کامل شریعت ہو گی وہ کسی سابقہ شریعت کا محتاج اور تابع نہیں ہو گا۔ وہ ایسے ضابطے اور قوانین دنیا کو دے گا جو حق و باطل میں امتیاز کر دیں گے اور گناہ و ثواب کے راستے متعین کر دیں گے۔

حضرت مسیحؑ ان گناہوں کی نشاندہی فرماتے ہیں جن کا ارتکاب ان کی قوم نے

---

(۵) یوحنا کی انجیل باب ١٦۔ آیت ۷ تا ۸

(٦) یوحنا کی انجیل باب ١٦۔ آیت ١٢ تا ١٣

کیا فرمایا:

> "وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے مجھے راستباز نہیں جانتے، مجھے مجرم قرار دے کر سزا کا مستحق ٹھہرایا جا رہا ہے" (۷)

فرماتے ہیں کہ آنے والا "روح حق" مجھے ان الزامات سے بری کرے گا جو میری قوم نے مجھ پر لگائے ہیں۔ یہ بہت ہی غور کا مقام ہے وہ کون تھا جو حضرت مسیحؑ کے بعد آیا اور جس نے آپؑ کو بے قصور ٹھہرایا؟ صرف ایک ہی وجود تھا جو حضرت مسیحؑ کے بعد ظاہر ہوا اور وہ تھے ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو حضرت مسیحؑ کے چھ سو سال کے بعد مبعوث ہوئے اور آپؐ کے ذریعے حضرت مسیحؑ پر سے وہ سارے الزامات دور کر دیئے گئے، جو یہود نے ان پر لگائے تھے چنانچہ قرآن شریف حضرت مسیحؑ کے بارے میں فرماتا ہے کہ:

> اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (مریم-۳۱)

یعنی حضرت مسیحؑ کو کتاب و نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ پھر فرمایا:

> وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ-۸۷)

یعنی حضرت مسیحؑ کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا گیا اور روح القدس کے ذریعے آپؑ کی تائید کی گئی۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

> وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (آل عمران-۴۵)

جنابِ مسیحؑ دنیا و آخرت دونوں میں صاحبِ منزلت تھے اور

---

(۷) یوحنا کی انجیل باب نمبر ١٦۔ آیت ١٠ تا ١٢۔

مقرب الٰہی بھی۔

اب ان آیات مبارکہ کی تھوڑی سی تشریح۔

حضرت مسیحؑ کے دشمن آپؑ کو کاذب کہتے تھے، فریب کار قرار دیتے تھے۔ حضورؐ اقدس کے ذریعے اس الزام کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ مسیحؑ کو تو کتاب و نبوت سے سرفراز کیا گیا جب کہ جھوٹے اور فریب کار خدا کی بارگاہ سے دھتکار دیئے جاتے ہیں۔ پھر آپؑ کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ انہیں روشن دلائل کے ساتھ بھیجا گیا اور روح القدس کے ساتھ ان کی تائید کی گئی۔ ظاہر ہے کہ روح القدس انہی پر نازل ہوتا ہے اور انہی کی تائید کرتا ہے جو خدا کی جناب میں مقبول ہوتے ہیں اور جنہیں خدا اپنے لئے چن لیتا ہے۔ روشن دلائل بھی انہی صاحب بصیرت اور روحانی شخصیتوں کو دیئے جاتے ہیں جو خدا کی نظر میں برگزیدہ ہوتی ہیں۔ پھر فرمایا کہ مسیحؑ تو دنیا اور آخرت دونوں میں صاحب قدر و منزلت تھے جنہیں قرب الٰہی حاصل تھا یہ ایک اور ثبوت ہے اس حقیقت کا کہ اللہ تعالیٰ انہیں مقام نبوت پر سرفراز فرما چکا تھا اور وہ اس کے پسندیدہ وجود تھے، انہیں ہر قدم پر تائید الٰہی حاصل تھی ورنہ ممکن ہی نہ تھا کہ انہیں دنیا و آخرت دونوں میں وجاہت و منزلت نصیب ہوتی۔

پھر فرمایا:

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ (المائدہ۔۷۵)

اس (مسیحؑ) کی والدہ راست باز اور صادق القول تھی۔

اس طرح قرآن شریف نے ان دو لفظوں میں حضرت مسیحؑ اور آپؑ کی والدہ دونوں کے مقاماتِ بلند کا تعین فرماتے ہوئے ان قدسی نفوس کو ان تمام الزامات سے پاک و منزہ قرار دیا جو ان کے دشمن ان پر لگا رہے تھے۔ حضرت مسیحؑ کی والدہ کو ایک بہت ہی گندے اور ناپاک الزام سے مطعون کیا جا رہا تھا اور حضرت مسیحؑ کے حسب

نسب پر سخت اعتراضات کئے جا رہے تھے۔ حضورؐ اقدس کے ذریعے اعلان کر دیا گیا کہ جناب مسیحؑ کی والدہ راست باز تھیں اور جب انہوں نے کہا کہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ میں بدکار ہوں تو وہ سچ کہہ رہی تھیں پس حضرت مسیحؑ کسی غلط فعل کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ محض خدا کی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ پھر جب ان کی ماں نے فرمایا کہ فرشتے نے مجھے بشارت دی ہے کہ مجھے ایک بیٹا دیا جائے گا جو کتاب و حکمت کا وارث ہوگا اور بنی اسرائیل کے لئے نبی ہوگا۔ (آل عمران۔۴۹) تو وہ سچ کہہ رہی تھیں کیونکہ وہ صدیقہ تھیں اور صدیق (راست باز) لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے۔

پس حضورؐ اقدس کو یہ شرف حاصل ہے کہ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت مسیحؑ ابن مریم نے آپؐ کی تشریف آوری کی بشارت دی اور یہ کہہ کر آپؐ کو اپنا محسن قرار دیا کہ "وہ آکر میری عدالت کرے گا" اس میں کیا شک ہے کہ اگر حضورؐ اقدس تشریف نہ لاتے اور آپؐ حضرت مسیحؑ کے حق میں کلمات خیر نہ کہتے تو ہمارے پاس ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا اور ہم ان کی تصدیق کرنے سے معذور تھے گویا حضورؐ اقدس اور آپؐ پر نازل ہونے والے قرآن کا حضرت موسیٰؑ اور جناب مسیحؑ دونوں کی امتوں پر احسان ہے۔

آنحضورؐ سراج منیر ہیں

دنیا میں جتنے بھی نبی آئے بلاشبہ وہ سب روشنی لے کر آئے اور ان کے آتے ہی اندھیرا کافور ہو گیا مگر جلد ہی پھر تاریکی نے غلبہ پا لیا لیکن ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ شرف و فضیلت حاصل ہے کہ آپ "سراج منیر" تھے آپؐ کے جانے کے بعد تاریکی غلبہ نہ پا سکی اور نہ پا سکے گی چنانچہ ارشاد ہوا:

وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب۔۴۶)

اور (اے رسولؐ) آپ لوگوں کو اللہ کے حکم سے اس کیؑ طرف بلاتے ہیں
اور نور کا چراغ ہیں۔

یعنی جس طرح چراغ اس وقت روشن ہوتا ہے جب شام ہوتی ہے اور اندھیرا چھانے لگتا ہے پس حضورؐ اقدس بھی اس وقت تشریف لائے جب ہر طرف تاریکی چھا چکی تھی اور بد قسمت انسان اندھیروں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ آپؐ نے تشریف لا کر بنی نوع انسان کو تاریکی کی بھول بھلیوں سے نکال کر روشن راہوں پر گامزن فرمایا۔ جس طرح جب چراغ گل ہوتا ہے تو ساتھ ہی ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے یعنی دن نکل آتا ہے گویا چراغ کی موجودگی میں بھی روشنی ہی روشنی ہوتی ہے اور اس کے گل ہونے کے بعد بھی روشنی ہی روشنی ہوتی ہے، اسی طرح آنحضورؐ جب تک دنیا میں جسمانی طور پر موجود رہے، روشن چراغ کی طرح ماحول کو روشن فرماتے رہے اور جب آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو اپنے پیچھے نور ہی نور چھوڑ گئے یعنی ایسی تعلیم جو قیامت تک بنی نوع انسان کی رہنمائی کرتی رہے گی اور اسے تاریکی میں ٹھوکریں کھانے سے بچاتی رہے گی۔ آپؐ کی امت میں ایسے قدس نفوس پیدا ہوتے رہیں گے جو حضورؐ اقدس کے چراغِ نور سے روشنی لے کر دنیا کو منور کرتے رہیں گے یعنی ایسے اولیاء، مصلحین مجددین جو خلفائے محمدؐ کی حیثیت سے حضورؐ اقدس کی نیابت کریں گے۔ یہ شرف صرف اور صرف ہمارے آقاؐ و مولا کو حاصل ہے کہ آپؐ کا چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا۔ ماضی میں جتنے انبیا آئے تھے ان میں سے کسی کی تعلیم اپنی اصل حالت میں موجود نہیں رہی۔ ان میں سے ہر نبی اپنی قوم اور اپنے زمانے کے لئے تھا۔ ان میں سے کسی کی امت میں اب اہل اللہ اور اولیا اللہ پیدا نہیں ہوں گے۔ یہ ساری امتیں بانجھ ہو گئیں۔ آج ان میں سے کسی کا چراغ روشن نہیں۔ سارے چراغ بجھ گئے لیکن ایک چراغ ہے جو روشن ہے اور

قیامت تک روشن رہے گا کیونکہ وہ سراج منیر ہے، نور کا چراغ اور وہ چراغ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوتِ کاملہ کا ہے۔ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)

آنحضورؐ کا وصلِ الٰہی

یوں تو دنیا کا ہر نبی اپنی قوم کے لئے درد رکھتا تھا، اس کی حالت زار دیکھ کر اس کا دل کڑھتا تھا، وہ اپنے رب کریم کے حضور اپنی قوم کی فلاح و خیر کے لئے دعائیں کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی توجہ چاہتا تھا مگر ہمارے آقا و مولا ﷺ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ بالکل منفرد تھا جس کی ایک جھلک اس ارشاد قرآنی میں دیکھی جا سکتی ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰی ○ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ○ (سورہ النجم۔
آیت نمبر ۷۔۸)

یعنی بنی نوع انسان کی حالت زار دیکھ کر رسول اقدس ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنے کی غرض سے اس کی طرف روحانی پرواز شروع کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے دل میں اپنی محبت کا جوش دیکھ کر (روحانی طور پر) آپ ﷺ کی طرف اترنا اور آپ ﷺ کے قریب ہونا شروع کیا پھر دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے اور باہم متصل ہو گئے جیسے دو کمانیں ایک دوسرے سے جوڑ دی جائیں اور ان میں بال برابر بھی فاصلہ نہ رہے۔

کیا تاریخ انبیا میں کوئی بھی نبی ایسا گزرا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس شرف و فضیلت سے نوازا ہو؟ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور اقدس ﷺ کے قرب کا وہ انتہائی مقام ہے جس کے بعد کوئی مقام باقی نہیں رہا۔

آنحضورؐ کو مقام محمود پر فائز کیا گیا

پھر اس مقام کی تشریح بھی فرمادی چنانچہ ارشاد ہوا:

وَ مِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ
رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ○ (بنی اسرائیل۔ آیت نمبر۷۹)

(یعنی اے میرے رسول! پس تھوڑا سا سو لینے کے بعد رات کو بیدار ہو کر اللہ کی عبادت کیا کر جو تجھ پر ایک اور خاص انعام ہے اس طرح امید رکھ کہ تیرا رب تجھے مقام حمد پر فائز کر دے گا۔)

اس آیت مقدسہ میں حضور اقدس ﷺ کو وہ مقام دیا گیا ہے جو آپؐ کو سارے انسانوں بلکہ سارے نبیوں سے ممیّز و ممتاز کرتا ہے یعنی دنیا کے تمام انسان اور تمام رسول و نبی اللہ تعالیٰ کی حمد کے لئے پیدا کئے گئے تھے مگر حضور اقدس ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی اتنی حمد کی، اتنا قرب الٰہی حاصل کر لیا کہ آپؐ خود حمد کے مستحق قرار پائے اور اب قیامت تک آپؐ کی تعریف کی جاتی رہے گی۔ بلاشبہ اس شرف میں دنیا کا کوئی نبی آپ ﷺ کا شریک و سہیم نہیں۔

آنحضورؐ پر درود و سلام بھیجنے کا حکم

پھر ارشاد ہوا:

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ○ (سورہ احزاب۔ آیت نمبر۵۶)

(یقیناً اللہ تعالیٰ اس نبی پر سلامتی نازل کر رہا ہے اور اس کے

فرشتے بھی اس پر سلام و رحمت بھیج رہے ہیں اس لئے اے ایمان والو تم بھی (میرے) نبی پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔)

پس رسول اقدس حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا مقام و مرتبہ انسانی وہم و گمان سے برتر و بالا ہے۔ جس پاک نبی پر خود اللہ تعالیٰ سلام بھیجے، اس کے فرشتے درود بھیجیں، اس کے مومن و مخلص بندے اس رسول کے درجات کی بلندی کے لئے ابدالآباد تک دعا کرتے چلے جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے سر اقدس پر ختم نبوت کا مقدس و لاثانی تاج سجایا جائے، اس کے مقام ارفع و اعلیٰ کا ادراک کون کر سکتا ہے۔

آنحضورؐ کا خصوصی ادب

انسانی تاریخ اور صحائف آسمانی گواہ ہیں کہ جس انداز سے ہمارے آقا و مولا ﷺ کو مخاطب کیا گیا اور جس ادب و احترام کو حضور اقدس ﷺ کے لئے لازم ٹھہرایا گیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپؐ کے سامنے بلند آواز سے بولنے کو منع کر دیا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> **"اے ایمان والو! میرے نبی کے سامنے اپنی آواز کو پست رکھو، ان کے سامنے اونچی آواز سے مت بولا کرو ورنہ یاد رکھو تمہاری ساری نیکیاں اور ساری خدمات جو تم بجا لاتے ہو وہ سب ضائع ہو جائیں گی (اور تم برباد ہو کر رہ جاؤ گے)" (سورہ الحجرات۔ آیت ۱)**

سوچئے کتنا مقام بلند ملا تھا حضور اقدس ﷺ کو۔ پھر فرمایا کہ

"میرے رسُول کو بیوقوفوں اور جاہلوں کی طرح آپ ﷺ کے

مکان کے پچھواڑے سے آوازیں مت دیا کرو جیسے کہ تم ایک دوسرے کو مکان سے باہر آنے کے لئے آوازیں دیتے ہو" (الحجرات۔ آیت ۴) (کہ اے فلاں! او فلاں ابنِ فلاں باہر آؤ)

اللہ تعالیٰ نے اس طریق کو اپنے محبوب کے لئے ناپسندیدہ اور خلافِ ادب قرار دیا، قابلِ مواخذہ ٹھہرایا کہ یہ طریقہ بھی ایسے لوگوں کے اعمال کو برباد کر کے رکھ دے گا۔

مزید فرمایا:

"اے ایمان والو! تم یہ نہ خیال کرو کہ تمہارا (میرے) رسول کو مخاطب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہو" (سورہ نور۔ آیت نمبر ۶۳)

یعنی میرے رسول کو ادب و احترام سے مخاطب کیا کرو۔

آنحضورؐ کے وقت عزیز کی قدر کرنے کا حکم

پھر فرمایا کہ:

"اے ایمان والو! میرے رسول کے گھروں میں ہرگز داخل نہ ہوا کرو سوائے اس کے کہ تمہیں کھانا کھانے کے لئے بلایا جائے اور نہ کھانا تیار ہونے کے انتظار میں اس کے گھروں میں بیٹھے رہا کرو (یعنی وقت سے پہلے جا کر مت بیٹھ جایا کرو) نہ باتیں کرنے کے شوق میں اس کے گھر میں ڈیرے ڈالے رہا کرو۔ ہاں جب رسول تمہیں دعوت دے تو چلے جایا کرو اور کھانا کھانے کے بعد اٹھ جایا کرو۔ رسول کے گھر میں تمہارا بلاوجہ بیٹھے رہنا اسے تکلیف دیتا تھا مگر وہ تمہیں منع کرنے سے حیا کرتا تھا لیکن اللہ سچی بات کہنے سے حیا نہیں کرتا" (سورہ احزاب آیت۔ نمبر ۵۳)

آپ نے غور کیا؟ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں یہ خصوصی اہتمام کیوں کیا جا رہا ہے؟ دراصل اس طرح ہمارے دلوں میں رسول اقدس ﷺ کی محبت جاگزیں کی جا رہی ہے، آپ ﷺ کا ادب کرنا سکھایا جا رہا ہے کیونکہ جب تک کسی ہستی سے سچی محبت نہ ہو، انسان کے دل میں اس کا غیر معمولی ادب نہ ہو اس وقت تک وہ اس کی باتوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جس کی وہ مستحق ہوتی ہیں۔ پس جب ہمارے دلوں میں حضور اقدس ﷺ کا ادب و احترام پوری طرح جگہ حاصل کر لے گا تو ہم آپ ﷺ کی ہر بات کو دل کے کانوں سے سنیں گے اور آپ ﷺ کے ہر حکم پر روح کی تمام توانائیوں سے عمل کریں گے اس طرح نہ صرف خود ہماری دنیا و عقبیٰ سنور جائے گی بلکہ آپؐ کی محبت اور سچی اطاعت کی بدولت ہم دنیا میں وہ انقلاب بھی لے آئیں گے جسے برپا کرنے کی غرض سے حضور اقدس ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ یہ حکمت ہے آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجنے اور آپؐ کا غیر معمولی ادب و احترام کرنے میں اور ۔۔۔۔ سچی بات تو یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا کردار اتنا پاکیزہ، اخلاق اتنا اعلیٰ و کریمانہ اور آپ ﷺ کا وجودِ مسعود بنی نوع انسان کے لئے شفقت سے اتنا لبریز تھا کہ انسان خود بخود آپ ﷺ کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کی زبان پر بے ساختہ حضور اقدس ﷺ کے لئے کلماتِ درود جاری ہو جاتے ہیں۔

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مکان کے پچھواڑے سے آوازیں مت دیا کرو جیسے کہ تم ایک
دوسرے کو مکان سے باہر آنے کے لئے آوازیں دیتے ہو"
(الحجرات۔ آیت ۴) (کہ اے فلاں! او فلاں ابنِ فلاں باہر آؤ)

اللہ تعالیٰ نے اس طریق کو اپنے محبوب کے لئے ناپسندیدہ اور خلافِ ادب قرار دیا، قابلِ مواخذہ ٹھہرایا کہ یہ طریقہ بھی ایسے لوگوں کے اعمال کو برباد کر کے رکھ دے گا۔

مزید فرمایا:

"اے ایمان والو! تم یہ نہ خیال کرو کہ تمہارا (میرے) رسول کو
مخاطب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو
مخاطب کرتے ہو" (سورہ نور۔ آیت نمبر ۶۳)

یعنی میرے رسول کو ادب و احترام سے مخاطب کیا کرو۔

آنحضورؐ کے وقت عزیز کی قدر کرنے کا حکم

پھر فرمایا کہ:

"اے ایمان والو! میرے رسول کے گھروں میں ہرگز داخل نہ ہوا کرو سوائے اس کے کہ تمہیں کھانا کھانے کے لئے بلایا جائے اور نہ کھانا تیار ہونے کے انتظار میں اس کے گھروں میں بیٹھے رہا کرو (یعنی وقت سے پہلے جا کر مت بیٹھ جایا کرو) نہ باتیں کرنے کے شوق میں اس کے گھر میں ڈیرے ڈالے رہا کرو۔ ہاں جب رسول تمہیں دعوت دے تو چلے جایا کرو اور کھانا کھانے کے بعد اٹھ جایا کرو۔ رسول کے گھر میں تمہارا بلاوجہ بیٹھے رہنا اسے تکلیف دیتا تھا مگر وہ تمہیں منع کرنے سے حیا کرتا تھا لیکن اللہ سچی بات کہنے سے حیا نہیں کرتا" (سورہ احزاب آیت۔ نمبر ۵۳)

آپ نے غور کیا؟ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں یہ خصوصی اہتمام کیوں کیا جا رہا ہے؟ دراصل اس طرح ہمارے دلوں میں رسول اقدس ﷺ کی محبت جاگزیں کی جا رہی ہے، آپ ﷺ کا ادب کرنا سکھایا جا رہا ہے کیونکہ جب تک کسی ہستی سے سچی محبت نہ ہو، انسان کے دل میں اس کا غیر معمولی ادب نہ ہو اس وقت تک وہ اس کی باتوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جس کی وہ مستحق ہوتی ہیں۔ پس جب ہمارے دلوں میں حضور اقدس ﷺ کا ادب و احترام پوری طرح جگہ حاصل کر لے گا تو ہم آپ ﷺ کی ہر بات کو دل کے کانوں سے سنیں گے اور آپ ﷺ کے ہر حکم پر روح کی تمام توانائیوں سے عمل کریں گے اس طرح نہ صرف خود ہماری دنیا و عقبیٰ سنور جائے گی بلکہ آپؐ کی محبت اور سچی اطاعت کی بدولت ہم دنیا میں وہ انقلاب بھی لے آئیں گے جسے برپا کرنے کی غرض سے حضور اقدس ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ یہ حکمت ہے آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجنے اور آپؐ کا غیر معمولی ادب و احترام کرنے میں اور ---- سچی بات تو یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا کردار اتنا پاکیزہ، اخلاق اتنا اعلیٰ و کریمانہ اور آپ ﷺ کا وجودِ مسعود بنی نوع انسان کے لئے شفقت سے اتنا لبریز تھا کہ انسان خود بخود آپ ﷺ کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کی زبان پر بے ساختہ حضور اقدس ﷺ کے لئے کلماتِ درود جاری ہو جاتے ہیں۔

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

☆ ☆ ☆ ☆ ☆